UNIVERSAL
LIBRARY

رجسٹری شدہ سرکار عالی نمبر [illegible]

۱۲۶

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم و مغفور

کی یادگار

رسالہ

دلگداز

[illegible]

مرتبہ

محمد صدیق حسن [illegible]

مطبع دلگداز لکھنؤ

دلگداز

قدر افزایان دلگداز! آپ کے مسلسل تقاضوں کا نتیجہ ہے کہ دلگداز پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کے پرچے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ رسالہ اورنگ آباد دکن سے شایع ہوگا اور ہمارا خیال تھا کہ ہم اُس کے انتظامات کو مکمل کرنے بہت جلد اورنگ آباد سے شایع کر سکیں گے۔ مگر افسوس کہ ہم اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سب سے بڑی دِقت یہ آپڑی کہ ہمیں اورنگ آباد سے رسالہ شایع کرنے کی اجازت بہت دیر میں ملی۔ اور اب سرکار آصفیہ سے اجازت مل گئی تو یہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دلگداز اس سے پہلے بھی دولت آصفیہ سرکار عالی کی زیر حمایت بہت دنوں نکل چکا ہے۔ اگر اب پھر اس نے اسی سرزمین اور اُسی دولت آصفیہ کے دامن عاطفت میں پناہ لی ہے تو آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔

باوجود گزشتہ بے انتظامیوں اور سال سال بھر رسالہ شایع نہ ہو سکنے کے ہمارے احباب کو دلگداز کا شوق ایسا ہی ہو جیسا کسی عمدہ انتظام سے شایع ہونے والے پرچے کا ہوتا ہے اور وہ ہم سے بار بار

خط لکھ کے پوچھتے رہے کہ دلگداز کب سے شایع ہوگا۔ اپنے ان احباب کا ہم بہت شکریہ ادا کرتے ہیں اور ہمیں اسی بات پر فخر ہے اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ناظرین کو دلگداز اور اس کا لٹریچر کس قدر عزیز ہے۔ اور ان کو اس رسالے کا بند رہنا گوارا نہیں ہے۔ یہی چیز ہمیں آمادہ کرتی اور ہمت دلاتی ہے کہ چاہے کچھ ہو دلگداز کو ضرور شایع کرتے رہیں جو ہمارے احباب کے پاس پہنچ کے ہر ماہ ہماری یاد اُن کے دلوں میں تازہ کرتا رہے ٭

دلگداز بُرا ہو یا بھلا مگر پوری کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور باوجود اشاعت کی بدعنوانیوں کے ہمارے پاس خریداری کی درخواستیں برابر چلی آتی ہیں۔ اکثر اردو رسالوں کے مالک اس کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ انھیں اپنے پاس سے بہت سا روپیہ رسالے کی آمدنی کے علاوہ صرف کرنا پڑا۔ مگر شکر ہے کہ دلگداز کی یہ حالت نہیں۔ وہ ہمارا زیر بار احسان نہیں اور نہ اس سے پہلے کبھی ہوا۔

اس کی آغاز اشاعت کے متعلق والد مرحوم اپنی خود نوشت سوانح عمری میں جو ابھی شایع نہیں ہوئی فرماتے ہیں کہ سنہ ۱۸۸۶ عیسوی کے آخر میں ایک بار مولوی بشیر الدین صاحب (ایڈیٹر نجم الاخبار اٹاوہ) لکھنؤ میں آئے تو مجھے مشورہ دیا کہ میں ایک ماہوار رسالہ نکالوں اور اس پر اصرار کیا۔ میں نے عذر کیا کہ کون پوچھے گا۔ مگر وہ اپنے اصرار پر قائم رہے۔ میں نے کہا اچھا تو آپ چند خریدار دیجیے۔ اُنھوں نے اس کو قبول کیا۔ آخر اُنہیں کے مشورے سے قرار پایا کہ میں ایک رسالہ نکالوں جس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ ہو۔ صرف ایک جز یعنی سولہ صفحوں کا ہو۔ اُنھیں کے مشورے سے اس رسالے کا نام بھی "دلگداز" رکھا گیا

اور انھوں نے پانچ روپے میرے حوالے کیے کہ یہ پانچ خریداروں کا چندہ ہے جن کے نام بھی انھوں نے لکھوا دئے۔ انھیں پانچ روپوں سے میں نے دلگداز کا پہلا اشتہار چھپوا کے پیام یار میں شایع کرایا۔ خوش نصیبی سے پندرہ ہی روز کے اندر تیس چالیس درخواستیں قیمت کے ساتھ آگئیں اور انھیں روپوں سے دلگداز کا پہلا نمبر جنوری ۱۸۸۷ء میں چھپا۔ غرض دلگداز کی اشاعت میں ہمارا ایک پیسہ بھی نہیں لگا ٭

ہم نے دسمبر ۱۹۳۱ء کے رسالے میں اعلان کیا تھا کہ آیندہ رسالہ دلگداز اورنگ آباد دکن سے شایع ہوگا۔ اور خریداروں کو اختیار ہے کہ اپنا اپنا چندہ پیشگی بذریعہ منی آرڈر اورنگ آباد دکن روانہ کر دیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اکثر خریداروں نے اپنا چندہ پیشگی اورنگ آباد دکن میں بھیج دیا ہے۔ افسوس کہ اورنگ آباد سے اشاعت کی اجازت بہت دیر میں ملنے کی وجہ سے ہم اسے ۱۹۳۲ء میں نہ شایع کر سکے۔ جن اصحاب نے اپنا چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیج دیا ہے اُن کا وہ چندہ ۱۹۳۳ء کا شمار ہوگا۔ اب مہربانی کرکے بقیہ احباب بھی جن کی خدمت میں یہ رسالہ پہنچتا ہے ہمیں اپنا اپنا چندہ ڈیڑھ روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیج دیں اور اس میں کفایت بھی ہے کیونکہ وی۔پی روانہ کرنے میں تین آنے زیادہ ہو جائیں گے

جن اصحاب سے چندہ ذریعہ منی آرڈر نہ وصول ہوگا اُن کی خدمت میں آیندہ رسالہ سالانہ چندہ پر ایک روپیہ گیارہ آنے کا وی۔پی روانہ ہوگا۔ جن اصحاب کو آیندہ خریداری نہ منظور ہو وہ براہ کرم ہمیں مطلع کر دیں تاکہ وی پی نہ روانہ کیا جائے ٭

دلگداز کا حجم کم سے کم ۴۲ صفحے رہا کرے گا۔ اس میں کوئی ناول نہیں شایع ہوگا کیونکہ ناول کے چند صفحے بالکل بے لطف ہوتے ہیں۔ اور سال کے آخر میں کوئی مکمل ناول بھی نذر نہ کیا جا سکے گا کیونکہ دلگداز کے پورے چوبیس صفحات پر حسب سابق مختصر تاریخی اور ادبی مضامین ہوا کریں گے۔ فی الحال اسی میں سے چند صفحات پر والد مرحوم مولانا شرر کی خود نوشت سوانح عمری مسلسل شایع ہوتی رہے گی ۔

عموریہ یعنی بروسا کی فتح

از ایڈیٹر

عباسی خلیفہ معتصم باللہ دربار میں تخت پر بیٹھا تھا۔ عائدین سلطنت قرینہ سے بیٹھے تھے۔ دفعتہً ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ امیرالمومنین میں عموریہ میں تھا۔ ایک خوبصورت اور نازک اندام ہاشمیہ لڑکی کو رومیوں نے کسی طرح گرفتار کر لیا ہے۔ ایک ناہنجار رومی نے اُس کے منھ پر طمانچہ مارا تو وہ بے تاب ہو کے چلّانے لگی "وامعتصما" یعنے معتصم میری مدد کو آؤ۔ یہ سُن کر اُس بدمعاش نے طنزاً کہا ہاں معتصم تیری مدد کو ابلق گھوڑے پر سوار ہو کے آئے گا اور پہلے سے زیادہ مارنے لگا ۔

یہ واقعہ سُنتے ہی معتصم اپنے تخت پر بیٹھے ہی بیٹھے کہنے لگا لبیک لبیک یعنے میں تیری مدد کو حاضر ہوں۔ اُس شخص سے پوچھا کہ عموریہ کس طرف ہے۔ اُس نے اشارہ کر کے رُخ بتادیا۔ معتصم کو ایسا

جوش آیا کہ فوراً تخت پر سے اُٹھا اور سارے شہر میں کوچ کا اعلان کرا دیا۔ دریافت کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ عموریہ عیسائیوں کا بڑا مرکزی مقام ہے اور قسطنطنیہ سے زیادہ اُن کو عزیز ہے۔ اس لیے نہایت عظیم الشان پیمانے پر فوج کشی کا انتظام ہونے لگا اور ہتھیار اور چرڑے کے حوض اتنی تعداد میں جمع کیے گئے کہ گزشتہ لڑائیوں کے موقع پر اس کی نظیر نہیں ملتی۔

معتصم نے بارہ ہزار ابلق گھوڑے جمع کیے اور اپنی عظیم الشان فوج کو جس میں سوار اور پیدل تھے تین حصوں میں تقسیم کر کے روانہ کر دیا۔ یہ فوجیں دشمنوں کے ملک میں داخل ہوئیں اور انقرہ (انگورہ) ہوتی ہوئی عموریہ کے سامنے جا پہنچیں (عموریہ کو اب ہرہ کہتے ہیں) اور اس کا محاصرہ کر کے دیواروں کے سامنے اپنی منجنیقیں نصب کر دیں۔ عیسائیوں نے اس شہر کی حفاظت کا خاص انتظام کر لیا تھا اور غیر معمولی استحکام اور مضبوطی کا بندوبست ہو چکا تھا۔

اس لبیک کہنے کے واقعے کا ابو تمام حبیب طائی اپنے مدحیہ قصیدے میں یوں ذکر کرتے ہیں۔

لبیت صوتاً زبطریاً هرقت له ∴ کاس الکریٰ ورضاب الخرد العرب

لبیک کہی تو نے ایسی خوش آیند آواز پر کہ خواب آور جام اور عرب کی نازنینوں کے شربت گرا دیے گئے غرض معتصم نے وہاں پہنچ کے شہر کا محاصرہ کر لیا اور جب کافی زمانہ گزر چکا تو نجومیوں کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ یہ شہر کب فتح ہوگا۔ انھوں نے حساب لگا کر بتایا کہ جب انگور اور انجیر پک جائیں گے اُس وقت شہر پہ فتح حاصل ہوگی۔ یہ سُن کر معتصم کچھ پریشان اور غمگین ہو گیا۔

اسی پریشانی میں تھا کہ ایک رات کو اپنی فوج کی خبر گیری

کے لیے نکلا کہ دیکھیں لوگ کیا باتیں کرتے ہیں اتفاق سے اس کا گذر ایک لوہار کے خیمے کے پاس ہوا جو گھوڑوں کے نعل بنا رہا تھا۔ اس وقت لوہار کے سامنے ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا جو نعلوں کو گرم کر کے کوٹ رہا تھا اور ہر ضرب پر کہتا جاتا تھا کہ "معتصم کے سر پر" لوہار نے ڈانٹا کہ یہ کیا بیہودہ بک رہا ہے تجھے معتصم سے کیا مطلب؟ لڑکے نے جواب دیا کہ "معتصم کس قدر کم عقل شخص ہے کہ استنے زمانے سے یہاں پڑا ہوا ہے مگر فتح کرنے کی کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آتی۔ باوجودیکہ اس کے پاس اس قدر عظیم الشان فوجی قوت ہے۔ مگر شہر کو فتح نہ کر سکا۔ میں اب تک فتح کر چکا ہوتا!"

معتصم یہ باتیں سُن کے اپنے خیمے میں واپس آیا اور کچھ لوگوں کو اُس لڑکے کے لانے کے لیے بھیجا۔ صبح کو وہ لوگ اُس لڑکے کو لے آئے۔ معتصم نے اس سے کہا کہ فلاں فلاں باتیں جو مجھ کو معلوم ہوئی ہیں تم نے کیوں کہیں؟ لڑکے نے عرض کیا آپ کو جو کچھ معلوم ہوا ہے بالکل صحیح ہے۔ اگر اپنے خیمے کا پچھلا حصہ آپ میرے حوالے کر دیں اور لڑائی کے اختیارات میرے سپرد کر دیں، تو انشاء اللہ کل ہی عموریہ فتح ہو جائے گا۔ معتصم نے کہا میں تم کو اس کا مختار کرتا ہوں۔ اور لڑائی کے اختیارات اُسے دے دیے۔ اُس نے تیر اندازوں کو جمع کیا اور اُن میں ایسے لوگ چن لیے جو ٹھیک نشانہ لگانے میں مشاق تھے۔

عموریہ کی شہر پناہ کی دیوار پر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کے بدن پر اوپر سے نیچے تک کڑی کا ایک خط تھا جو تین بالشت یا اس سے کچھ زیادہ چوڑا تھا۔ اس لڑکے نے تیروں کو آگ میں خوب گرم کرا کے تیر اندازوں

سے کہا کہ اس سیاہ خط پر نشانہ لگاؤ۔ یہ خط ساگون کی لکڑی کا تھا۔ جب اِن پر جلتے ہوئے تیر پہنچے تو لکڑی جل اُٹھی۔ ایک ایک کرکے سب تصویریں جل کے گر پڑیں اور فصیل میں راستہ ہوگیا۔ اب کیا تھا مسلمان تلواریں لیے شہر میں گھس گئے۔ اُس زمانے سے قبل جو نجومیوں نے بتایا تھا عموریہ ہرگز فتح ہوگیا ✣

ابوتمام حبیب طائی اپنے مدحیہ قصیدے جو اُس نے فتح عموریہ پر لکھا تھا کہتا ہے۔

تلوار کتابوں سے زیادہ سچی خبر دینے والی ہے۔ اس کی دھار سنجیدہ اور فضول باتوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ تلوار کی سفیدی نہ کہ کتابوں کی سیاہی اُس کے متنوں میں ریب اور شک کا دفعیہ ہے ✣

معتصم جب عموریہ میں داخل ہوا تو اُس کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جس نے اُس حسین ہاشمیہ لڑکی کا واقعہ بیان کیا تھا کہ اُس نے معتصم کو مدد کے لیے آواز دی تھی معتصم نے اُس شخص سے کہا کہ اب مجھ کو اُس جگہ لے چلو جہاں تم نے اُس لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ شخص معتصم کو اُس مقام پر لے گیا۔ اتفاق سے وہ لڑکی وہاں موجود تھی وہ شخص اُس کو معتصم کے سامنے لے آیا۔ معتصم نے اُس سے پوچھا مظلوم لڑکی بتا معتصم نے تیری آواز سُنی یا نہیں؟ پھر وہ رومی شخص جس نے اس کو طمانچہ مارا تھا اور وہ شخص جس کے قبضے میں لڑکی تھی حاضر کیے گئے۔ معتصم نے اُن دونوں کو غلام بنا کے مع اُن کے کل مال و اسباب کے لڑکی کے حوالے کردیا۔ اُس عورت سے عموریہ جسے اب بروسا کہتے ہیں مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔

من آنم کہ من دانم

یعنی

مولانا شررؔ مرحوم کی خودنوشت سوانح عمری

"آپ بیتی"

نسب و خاندان :-

جہاں تک بزرگوں اور آباؤ اجداد سے سنا ہیں عباسی النسل ہوں پہلے بزرگ جو وارد ہند ہوئے وہ سلطان محمد تغلق کے دربار میں سادات بنی عباس کی قدردانی سن کر ترکستان چھوڑ کے وارد دہلی ہوئے۔ اور دربار شاہی میں عزت سے لیے گئے۔ ایک زمانے کے بعد اُن کی نسل نے علاقۂ جونپور میں جگہ پائی اور سلاطین شرقیہ کے [illegible] عنایت بنے۔ اور ایک اچھی موروثی جائداد اور حقوق رکھتے تھے ؛

انھیں میں سے ایک بزرگ تھے مولانا معزالدین جو ایک صاحب علم مقتدائے طریقت تھے۔ اُن کے بڑے فرزند مولانا حسام الدین والد بزرگوار کی خدمت میں رہے۔ مگر چھوٹے بیٹے مولوی نظام الدین نے شوق علم میں وطن کو خیرباد کر کے دہلی کی راہ لی اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے حلقۂ طلبہ میں زانوے شاگردی تہ کیا۔ یہاں [illegible] وطن سے اس درجہ قطع تعلق کر لیا کہ وطن سے

جو خطوط آتے اُن کو بغیر پڑھے ایک گھڑے میں ڈال دیتے تاکہ طلب علم کی یکسوئی میں فرق نہ آئے۔ چھ سات سال بعد تحصیل علم سے فارغ ہوکر اُن خطوں کو نکال کے پڑھا تو ایک ساتھ بہت سے عزیزوں خصوصاً پدر بزرگوار مولانا معزالدین کی وفات کے حادثے سُن کر نہایت ملول ہوئے اور استاد علّامہ سے رخصت ہوکر گھر کی راہ لی ؛

سواد وطن میں داخل ہوئے تو بے مہر بھائی جنھوں نے تمام آبائی جاگیر اور زمینداری پر قبضہ کر لیا تھا نہایت بد سلوکی سے پیش آئے۔ برادر معظم کی یہ بے اعتنائی دیکھ کر مولانا نظام الدین کا دل وطن سے کھٹا ہوگیا۔ اور گھر بار چھوڑ کے پھر مغرب کی راہ لی۔ اور ارادہ کیا کہ لکھنؤ میں ٹھہر کے علمائے فرنگی محل سے معقولات کی تحصیل کریں۔ یہاں بعض علما کی شاگردی اختیار کی ؛

اب اُنھیں علوم باطنیہ کی طرف توجہ اور کسی مرشد کامل کی تلاش تھی۔ لکھنؤ میں پہونچے تو سنا کہ قصبۂ کرسی میں مولانا شاہ نجابت اللہ اتنے بڑے ولی کامل ہیں کہ دور دور تک اُن کا سا حقیقت آگاہ نہیں سنا جاتا۔ علمائے فرنگی محل اُن کے مرید اور حلقہ نشین ارادت ہیں۔ فوراً اُن کی خدمت میں پہونچے اور خدام میں داخل ہوکر دشت وحدت کی شناوری کرنے لگے ؛

حقیقت آگاہ شاہ نجابت اللہ صاحب نے اُن کی شادی کرسی کے خطیب صاحب کی بیٹی سے کرادی جن کا اہل قصبہ احترام کرتے تھے۔ اِس لئے کہ وہ نسلاً بعد نسل دربار دہلی کی منظوری سے کرسی کے خطیب چلے آتے تھے۔ اور اِس کے صلے میں اُنھیں ایک کافی مقدار میں زمین بطور جاگیر دربار دہلی سے ملی تھی جو اُن کے قبضے میں تھی ؛

خطیب صاحب کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو خطیب صاحب مرحوم کے بھتیجوں نے جاگیر کے لئے جھگڑا کیا۔ مولانا شاہ ولایت اللہ صاحب نے کوشش فرمائی کہ وہ جاگیر مولانا نظام الدین صاحب کو ملے۔ مگر خود مولانا نے اس کو ناپسند کیا اور جب اپنی ساری جائداد کمال بےنفسی سے وطن میں چھوڑ آئے تھے تو یہاں اس کے حاصل کرنے کے لئے کیا تگ و دو کرتے۔ غرض خطابت کی جاگیر کو انھیں لوگوں کے حوالے کرکے لکھنؤ چلے آئے ؛

یہاں اُن دنوں مارٹن صاحب کا دور دورہ تھا جن کی کوٹھی مارٹین صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور اور سیاحوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ مارٹن صاحب کو عربی و فارسی کی تعلیم پانے کے لئے کسی قابل عربی و فارسی داں مدرس کی ضرورت تھی۔ مولانا نظام الدین امیدوار بن کے اُن کے پاس گئے تو فوراً رکھ لیا اور اپنا اُستاد بنا کے تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی اور رہنے کو ایک وسیع مکان دیا تاکہ اہل و عیال کے ساتھ بہ اطمینان رہ سکیں۔ چنانچہ اُس وقت سے ایک مدت دراز تک اُن کا قیام مارٹین کی کوٹھی میں رہا۔ مارٹن صاحب ان کا نہایت ہی ادب و احترام کرتے تھے اور اُن کے عزیزوں میں جو لڑکے تھے وہ بھی مولانا سے تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ نامی گرامی شاعر آغا حجو شرف نے بھی جو مارٹین صاحب کی بیوی کے عزیز قریب تھے اور وہیں رہتے تھے اول سے آخر تک مولانا ہی سے تعلیم پائی۔

مولانا نظام الدین یہاں آکر رہے تو ان کی بیوی اور دو بیٹے جن میں سے ایک کا نام مولوی محمد اور دوسرے کا مولوی اسعد تھا ساتھ تھے۔ معمول تھا کہ لوگوں سے بہت کم ملتے۔ بجز

اس کے کہ کبھی کبھی مرزا رفیع سودا کے پاس چلے جاتے جن سے زیادہ راہ و رسم ہو گیا تھا۔ ایک دن مرزا صاحب کے پاس گئے تو وہ ایک خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایش کی کہ اس وقت کوئی شعر تصنیف کر کے سنائیے۔ مرزا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خیمے کی چھت میں ایک بہت چھوٹا سوراخ تھا۔ اُس میں سے شعاعِ آفتاب آ کے فرش پر پڑ رہی تھی اور دھوپ کی چتی فرش پر ایسی معلوم ہوتی کہ جیسے موتی پڑا ہوا ہے۔ سودا نے اُسی کی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا:

عرصۂ دنیا میں اپنا تنگ کیا کاشانہ ہے
پرتوِ خورشید یاں موتی کا جیسے دانہ ہے

یہیں مارٹن کی کوٹھی میں مولوی نظام الدین کے بڑے فرزند مولوی محمد کے ایک فرزند پیدا ہوا۔ اس فرزند کا نام عبدالرحیم رکھا گیا۔ مگر ماں نے اپنے مذاق کے مطابق تفضل حسین کے نام سے یاد کیا۔ چنانچہ اسی نام سے اُن کی شہرت ہوئی اور یہی میرے والد محترم تھے:

اس اثنا میں مارٹن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنے تمام ملازمین اور اعزہ کے نام وثیقہ جاری کر دیا تھا۔ مولانا نظام الدین صاحب کے نام بھی چاہا کہ اُن کی پوری تنخواہ وثیقہ کے طور پر ہمیشہ کے لئے جاری کرا دیں جو اُن کی اولاد و احفاد کو نسلاً بعد نسل ملتی رہے۔ مگر مولانا نظام الدین نے محض اس خیال سے کہ یہ وثیقہ سود کی رقم سے ملے گا باوجود مارٹن صاحب کے اصرار کے نہیں منظور کیا۔ چنانچہ مارٹن صاحب کے مرتے ہی سلسلۂ ملازمت منقطع ہو گیا:

اب وہ تمام خاندان والوں کو ساتھ لے کر پھر کرسی میں پہونچے۔ وہاں گئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ ہیضے کی شدت ہوئی۔ یوں تو بستی بھر میں صدہا آدمی مر گئے مگر مولانا نظام الدین کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ خود اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کے بڑے بیٹے مولوی محمد صاحب یعنے میرے جد امجد نے داعی اجل کو لبیک کہی۔ اور جتنے لوگ گھر میں تھے یکے بعد دیگرے سب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مہینے سوا مہینے کے اندر تقریباً پچیس مُردے گھر سے نکل گئے۔ اور یہ حالت تھی کہ اِن کے گھر میں کوئی عیادت و تعزیت کو بھی نہ آتا۔ ہر شخص کی زبان پہ تھا کہ اس گھر میں مری (موت) آئی ہوئی ہے۔ جو جائے گا زندہ نہ بچے گا۔

مولوی نظام الدین کے صرف چھوٹے فرزند مولوی احمد، اُن کی بھاوج یعنی مولوی محمد مرحوم کی جوان بیوہ اور اُن کے تین بچوں کے سوا کوئی زندہ نہ بچا۔ جنھوں نے بھاگ کے لکھنؤ میں پناہ لی۔ بعد ازاں مولوی احمد صاحب اپنی ایک سالی کے یہاں چلے گئے جو کاکوری میں رہتی تھیں۔ اور مولوی محمد کی بیوہ تینوں بچوں کو گلے سے لگائے اپنے ایک رشتے کے ماموں مولوی محمد رضا صاحب کے گھر میں ٹھہریں۔ جہاں پہونچ کر اُن کے دو بچے داغ دے گئے۔ اور اب اس خاندان کی یادگار فقط میرے والد تفضل حسین صاحب تھے جو مرحوم بھائیوں سے چھوٹے اور صغیر سن بچے تھے۔

چند روز بعد اُن کے چچا مولوی احمد صاحب نے حاجی حرمین شریفین کی ایجنسی قبول کر لی۔ حاجی صاحب کے مطبع نے فارسی

اور عربی کی درسی کتابوں کو نہایت خوبی سے چھاپنا شروع کیا تھا۔ اور مولوی احمد صاحب نے یہ تعلق پیدا کرتے ہی ہر ملک کا دورہ شروع کیا۔ اور اس دورے میں اپنے کمسن بھتیجے کو جن کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی ساتھ لے لیا:

اس خدمت کے انجام دینے کے لئے وہ لکھنؤ سے مغرب کی طرف چلے تو بہلوں اور بیل گاڑیوں پر بیٹھ کے مع کتابوں کے ایک بڑے بھاری اسٹاک کے دہلی اور لاہور ہوتے ہوئے پشاور تک چلے گئے۔ درمیان کے اکثر شہروں اور گاؤں میں حسب ضرورت قیام کرتے۔ جب اسٹاک ختم ہو جاتا تو لکھنؤ سے اور کتابیں منگوا لیتے والد کی اس غریب الوطنی اور رہ نوردی کے زمانے میں اُن کی والدہ مولوی محمد رضا صاحب کے پاس رہتی تھیں۔ وہی اُن کے متکفل تھے اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اور اُن کی اس اندوہناک بیوگی کے زمانے میں جیسی مہربانی و شفقت اُن کے حال پر مولوی محمد رضا صاحب نے کی اس کو اُس زمانے کی دردمندی اور کریم النفسی کا بہترین نمونہ کہنا چاہئے:

ماں سے جدا ہو کر والد مرحوم نے آغاز عمر کے سات آٹھ سال اپنے محترم چچا کے ساتھ سیاحت و صحرا نوردی میں صرف کیے اور اسی سیاحت میں فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ اُس زمانے کے لحاظ سے جب کہ حصول علم دنیا کے لئے نہیں بلکہ درستی اخلاق و شائستگی و نیک نفسی کی تکمیل کے لئے حاصل کیا جاتا تھا اِن کی تعلیم نہایت ہی اعلیٰ درجے کی تھی۔ اور ایک مدت تک پنجاب میں رہنے کے باعث پنجابی زبان بے تکلف بولتے اور پنجابیوں سے اُنھیں خاص قسم کا اُنس تھا۔ جہاں کوئی پنجابی نظر آ جاتا اُس سے خلوص سے

ملتے اور عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے ۔

پنجاب سے واپس آنے کے بعد ہی اُن کی شادی محض اُن کی اعلیٰ قابلیت کی بدولت منشی محمد قمرالدین صاحب کی صاحبزادی سے ہو گئی جو کرسی کے تمام اعزہ میں زیادہ شریف، قابل اور سربرآوردہ و ممتاز تھے ۔ خاندان کے لحاظ سے وہ شیخ صدیقی تھے اور سلسلۂ نسب محمد بن ابی بکر صدیق سے ملتا تھا ۔ وہ پانچ بھائی تھے ۔ اور پانچوں نہایت ہی ابرار اور متقی و پرہیزگار لوگ مانے جاتے تھے ۔

مگر دنیوی جاہ و ثروت کے لحاظ سے منشی قمرالدین سب بھائیوں سے بڑھے ہوئے تھے ۔ شاہی دربار اودھ میں ایک معزز خدمت پر مامور تھے ۔ انتزاع سلطنت اودھ کے وقت جب واجد علی شاہ لندن جانے کے لئے لکھنؤ سے روانہ ہوئے ہیں تو تقرب دربار کے باعث وہ بھی ساتھ گئے ۔ اور کلکتے پہنچ کر جب بادشاہ وہاں رک گئے اور اُن کا شاہی وفد جس میں شاہ معزول کی والدہ محترمہ جناب عالیہ اور ولی عہد تھے انگلستان یا تو جو وفد مولوی مسیح الدین خاں صاحب کی زیر نگرانی ساتھ روانہ ہوا اُس کے سردفتر کی حیثیت سے منشی قمرالدین صاحب انگلستان گئے ۔ اور بعد غدر ۱۸۵۷ء جب اس وفد کو ناکامی ہوئی تو وہ قاہرہ و بیت المقدس کی زیارت اور نعمت حج سے شرفیاب ہوتے ہوئے کلکتے میں واپس آئے ۔ اور بادشاہ کی ملازمت اختیار کرکے مٹیا برج میں رہنے لگے ۔

باقی آئندہ

نصر بن سیار کنانی

از ایڈیٹر

نصر بن سیار کنانی بنی امیہ کا ایک نہایت عقلمند، دور اندیش، مدبر اور بہادر سردار تھا۔ اپنے ایام حکومت میں اُس نے خراسان کو اس قدر ترقی دی اور اس کی آبادی و سرسبزی کو ایسا بڑھایا کہ اس سے قبل اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسد بن عبداللہ کی وفات کے بعد سنہ ۱۲۰ ہجری میں نصر بن سیار اُن کی جگہ خراسان کا والی ہوا۔ اور اپنی موت یعنے سنہ ۱۳۱ھ تک وہاں حکومت کرتا رہا۔ اس حساب سے اُس کی مدت حکومت دس سال ہوئی۔

نصر بن سیار خراسان کا والی ہونے سے پہلے فوجی افسروں میں تھا اور بعض شہروں کا حاکم بھی رہ چکا تھا۔ سنہ ۱۱۲ھ میں ترکوں کے بادشاہ خاقان اور اُس کے حلیف سردار کورصول اور مسلمانوں میں سخت لڑائیاں ہوئیں۔ اُس زمانے میں جنید بن عبدالرحمٰن مسلمانوں کے سپہ سالار تھے۔ ایک مقام پر اسلامی فوجیں گھاٹی میں اس طرح پھنس گئیں کہ نہ واپس جانے کا راستہ باقی رہا اور نہ آگے بڑھنے کا۔ کیونکہ خاقان نے جنگل اور پہاڑوں میں آگ لگوادی۔ مسلمانوں کے بہت سے آدمی اسی آگ میں جل کے تباہ ہو گئے۔ اس لڑائی میں سورہ اور جراح کے ایسے بہادر شہ سوار کام آئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص بھی زندہ نہ بچا ہوتا۔ مگر اس جنگ میں نصر بن سیار نے ایسی غیر معمولی اور بہادری دکھائی اور کچھ اس طرح دور اندیشی سے کام لیا کہ مسلمانوں کی ست بڑی جماعت تباہ ہونے سے بچ گئی اور آخر میں خاقان کو

شکست بھی ہوگئی ٭

ایک دفعہ نصر بن سیار کے سامنے بخارا کی حکومت پیش کی گئی - نصر نے اس کے متعلق اپنے دوست بختری بن مجاہد سے مشورہ کیا - اُس نے کہا کہ آپ اس کو قبول نہ کیجئے ایک زمانہ آئیگا کہ آپ سارے خراسان کے حاکم ہوں گے - جب یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور نصر کو اپنے حاکم خراسان ہونے کی اطلاع ملی تو اُس نے بختری کو بلوا بھیجا - بختری کے پاس جب بلاوا پہنچا تو اُس نے اپنے ندیمان صحبت سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ نصر خراسان کا والی ہوگیا اور فوراً نصر کے پاس آیا - سامنا ہوتے ہی بختری نے جھک کے بڑے ادب کے ساتھ اُسی طرح سلام کیا جس طرح اُمرا کو سلام کیا جاتا ہے - نصر یہ دیکھ کے ہنس پڑا اور بولا تم کس طرح سمجھے کہ میں امیر ہوگیا ہوں - بختری نے جواب دیا پہلے جب کوئی ضرورت ہوتی تھی تو آپ خود میرے پاس چلے آیا کرتے تھے - عادت کے خلاف آج آپ نے مجھے بلا بھیجا تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ ضرور والی ہو گئے ہیں ٭

جب اسد بن عبد اللہ حاکم خراسان کی وفات کی خبر خلیفہ ہشام بن عبد الملک کو پہنچی تو اُس نے خراسان کی ولایت کے بارے میں عبد الکریم بن سلیط حنفی سے مشورہ لیا جو اُس زمانے کے ایک جید عالم تھے عبد الکریم نے عرض کیا امیر المومنین خراسان کا سب سے زیادہ سمجھدار اور عقلمند شخص تو وہ کرمانی ہے - لیکن آپ اُس سے کوئی تعلق نہ رکھیے - ہشام نے اُسکا نام پوچھا - عبد الکریم نے بتایا جدیع بن قوی ہشام نے کہا مجھ کو ایسے شخص کی ضرورت نہیں اور اس نام کو منحوس خیال کیا - عبد الکریم نے کہا تو پھر تجربہ کار اور مسن

آدمی یحییٰ بن نعیم بن ہبیرہ شیبانی ہیں۔ ہشام نے جواب دیا نہیں ربیعہ بوڑھے ہوگئے ہیں اُن سے سرحد کی حفاظت نہ ہوسکے گی۔ عبدالکریم کہتے ہیں اب میں نے خیال کیا یمن کے آدمی کو ناپسند کرتا ہے لاؤ کسی مضری قبیلے کے شخص کو پیش کروں۔ اور میں نے کہا عقیل بن معقل لیثی ہوسکتا ہے اگر اُس کی ایک کمزوری کا خیال نہ کیا جائے۔ ہشام نے پوچھا وہ کیا۔ میں نے بتایا کہ وہ پاک باز اور محتاط نہیں ہے۔ ہشام نے کہا مجھ کو ایسے شخص کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا پھر منصور بن ابی خرقا ہے اگر اس کی ایک بُرائی سے آپ درگزر کریں کیونکہ وہ منحوس آدمی ہے۔ ہشام نے کہا نہیں کوئی دوسرا نام پیش کرو۔ میں نے کہا مجشر بن مزاحم عقلمند شخص ہے، بہادر اور سمجھدار بھی ہے لیکن کچھ جھوٹ بولتا ہے ہشام نے کہا جھوٹ میں بھلائی نہیں۔ میں نے کہا یحییٰ بن حصین کو مقرر کر دیجئے۔ ہشام نے جواب دیا ان سے بھی سرحد کی حفاظت نہیں ہوسکے گی۔ میں نے کہا پھر نصر بن سیار۔ ہشام نے کہا ہاں یہ شخص البتہ موزوں ہے۔ میں نے کہا وہ پاکدامن عقلمند اور تجربہ کار ہے اور اس کا نام میں سب سے پہلے پیش کرتا مگر اس میں ایک بات ضرور ہے۔ ہشام نے کہا وہ کیا؟ میں نے کہا اُس کے خاندان کے لوگ خراسان میں بہت کم ہیں ہشام نے کہا اس کی کوئی پروا نہیں۔ مجھ سے بہتر کوئی اس کے خاندان کا آدمی نہ ہوگا۔ آج میں خود اُس کے خاندان میں ہوں۔ پھر نصر بن سیار کے متعلق فرمان لکھا اور عبدالکریم کے ہاتھ روانہ کیا۔ عبدالکریم نے جب وہاں پہنچ کر نصر کو والی ہونے کی خوشخبری سنائی تو نصر نے خوش ہوکر ان کو دس ہزار درہم دیے ✦

نصر بن سیار نے والی ہوتے ہی خراسان میں اپنے قبیلے کے آدمیوں کو مقرر کرنا شروع کر دیا اور چند روز میں یہ حالت ہو گئی کہ مضری قبیلے کے سوا اور کسی قبیلے کا آدمی عامل ہی نہ ہوتا۔

۱۲۱ھ میں نصر نے نہر جیحون کو پار کر کے دو بار دشمنان اسلام پر فوج کشی کی۔ ایک بار باب جدید کی طرف روانہ ہوا تو بلخ سے ہوتا ہوا مرو میں آگیا۔ مرو میں پہنچ کر اس نے لوگوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اعلان کیا کہ میں نے یہاں منصور بن عمر بن ابی خرقا کو دادرسی اور مظالم کے دفع کرنے کے لئے مقرر کیا ہے۔ جو لوگ اسلام لا چکے ہیں اُن سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور مشرکین پر سے بھی اِس کا بار ہلکا کیا جاتا ہے۔ اس کا عوام پر بہت اثر پڑا اور پورا ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ تین ہزار ایسے مشرکین آگئے جن سے جزیہ وصول ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ عمر بن خرقا نے مسلمانوں کو جزیہ معاف کر کے ان پر مقرر کیا اور آمدنی کی مقدار دگنی ہو گئی اور اس رقم کو حسب موقع ملک کی بہبود کیا خرچ کرنا شروع کیا۔

نصر نے اسی سال دوسری فوج کشی کاشغر اور سمرقند کی جانب کی۔ کورصول پندرہ ہزار فوج کے ساتھ مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے آیا۔ کورصول کے ساتھ حارث بن سریج بھی تھا۔ حارث اس کے قبل خراسانی اور اسلامی فوج کے افسروں میں تھا لیکن بعد کو ایک فتنے کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کو معزول کر دیا اور وہ تاتاریوں کے پاس چلا گیا پھر کورصول کے ساتھ ہو گیا۔ کورصول نے چالیس سواروں کے ساتھ نہر جیحون کو عبور کیا اور رات کی تاریکی میں مسلمانوں پر

شبخون مارا۔ نصر خبر ملتے ہی فوراً آمادہ جنگ ہو گیا اور اپنی فوج میں کہلوا دیا کہ کوئی شخص باہر نہ نکلے سب اپنی اپنی جگہ پر ٹھیرے رہیں۔ پھر نصر کی اجازت سے عاصم بن عمیر جو سمرقندی فوج کا افسر تھا نکلا۔ دشمنوں کے کچھ سوار سامنے سے گزر رہے تھے عاصم خاموش کھڑا رہا۔ جب سب سوار گزر گئے تو اس نے سب سے آخری سوار پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ترکوں کا بادشاہ ہے۔ پھر پتہ چلا کہ نہیں یہ کورصول ہے عاصم اسے پکڑ کے نصر کے پاس لے آیا۔ نصر نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے بتایا کہ میرا نام کورصول ہے۔ نصر نے کہا سب تعریف اس خدا کے لیے ہے جس نے تم ایسے دشمن پر ہم کو قابو دلا دیا کورصول نے کہا کہ ایک بوڑھے شخص کو مار کے تم کیا کرو گے اگر تم مجھ کو چھوڑ دو تو میں تم کو چار ہزار اونٹ اور ایک ہزار گھوڑے دینے کو تیار ہوں۔

نصر نے اس کے متعلق اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیا۔ سب نے اس کے چھوڑ دینے کی رائے دی لیکن نصر نے اس کو منظور نہ کیا۔ پھر کورصول سے اس کی عمر پوچھی۔ اس نے کہا مجھ کو نہیں معلوم۔ نصر نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ تم کتنی دفعہ جنگ میں شریک ہوئے ہو۔ اس نے کہا بہتر لڑائیوں میں مسلمانوں کے خلاف لڑا ہوں۔ نصر نے کہا اگر وہ تمام چیزیں جن پر آفتاب اپنی روشنی ڈالتا ہے تم مجھ کو دے دو تب بھی میں تم کو آزاد نہ کروں گا پھر عاصم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس کے اسلحہ چھین لو۔ کورصول نے پوچھا کہ مجھے کس نے گرفتار کیا ہے۔ نصر نے کہا کہ عاصم بن عمیر نے کورصول نے کہا یہ سن کر اب مجھے مرنے کا افسوس نہیں کیونکہ

مجھ کو عرب کے ایک معزز شہسوار نے گرفتار کیا ہے۔ غرض وہ نہر جیحون کے کنارے قتل کیا گیا ؛

کورصول کے قتل ہونے کی خبر جب ترکوں کو پہنچی تو وہ دیوانہ وار پھرنے لگے۔ اپنے مکانوں میں آگ لگا دی اور اپنے کان، بال اور گھوڑوں کی دُمیں کاٹ ڈالیں۔ اس کامیابی کے بعد نصر خراسان میں واپس آیا ؛

اب یوسف بن عمیر امیر عراق نے نصر کو لکھا کہ اسلام کے ساتھ بے وفائی کرنے والے حارث بن سریج پر شاش میں کیوں نہیں حملہ کرتے وہ مسلمانوں سے باغی ہو کر دشمنوں سے جا ملا ہے۔ اگر خدا تم کو اُس کے اور اہل شاش کے مقابلے میں کامیاب کرے تو اُن کے شہروں کو تباہ کر دینا اور وہاں کے باشندوں کو گرفتار کر لینا کیونکہ وہ باغی ہیں۔ مگر مسلمانوں کا ہر موقع پر خیال رکھنا۔ نصر نے یہ خط اپنے لوگوں کو سنا کے اُن سے مشورہ لیا تو یحییٰ بن حصین نے کہا پہلے یہ دیکھیے کہ یہ خط کس کی طرف سے آیا ہے۔ آیا امیر المسلمین کا ہے یا کسی افسر کا؟ نصر نے جواب دیا یحییٰ سے ایک بار عاصم کے زمانہ حکومت میں میں نے ایک مسئلے کے متعلق گفتگو کی تھی۔ عاصم نے اس کی اطلاع خلیفہ کو دی اور اُس سے میری ترقی ہو گئی۔ اب بھی میں اُن کے بھائی کی رائے پر عمل کروں گا۔ یہ لوگ میرے بدخواہ نہیں ہیں۔“ یہ کہہ کر نصر نے شاش پر فوج کشی کی تیاری کر دی اور یحییٰ کو مقدمۃ الجیش کا افسر مقرر کر کے آگے روانہ کر دیا۔ یحییٰ شاش کی طرف روانہ ہوا اور قریب پہنچا تو حارث بن سریج مقابلے کے لیے آیا۔ یحییٰ کی فوج کے سامنے دو چھوٹی چھوٹی منجنیقیں نصب کرا دیں اور اخرم جو ترکوں کا نامور شہسوار

تھا مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ دیر تک لڑائی ہوتی رہی آخر مسلمانوں نے اخرم کو پکڑ لیا اور اُس کا سر کاٹ کے ترکوں کی طرف پھینک دیا۔ ترک اپنے افسر کا سر دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس معرکے کے بعد نصر نے خاص علاقۂ شاش کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں کے بادشاہ نے بیش قیمت ہدیوں اور ضمانت کے ساتھ صلح کی درخواست کی جس کو نصر نے اس شرط کے ساتھ منظور کر لیا کہ وہ حارث بن سریج کو اپنے ملک سے نکال دے۔ بادشاہ نے اس کو نکال دیا تو وہ فاراب میں آبسا لیکن وہاں بھی نہ ٹھیر سکا اور برابر ترکوں کے مختلف شہروں میں بھاگتا پھرا۔ جب اُس نے دیکھا کہ کہیں پناہ کی صورت نہیں ہے تو مسلمانوں سے صلح کر لی اور خراسان میں واپس چلا آیا۔ اور اپنے کو نصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ نصر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اس کا قصور معاف کر کے وہ تمام چیزیں جو ضبط کر لی گئی تھیں واپس کرا دیں۔

شاش میں صلح ہو جانے کے بعد نصر نے عمرو بن عاص کے غلام نیزک بن صالح کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور خود کوچ کرتا ہوا فرغانہ کے علاقے میں پہنچا۔ لیکن وہاں نصر کے پہنچنے سے پہلے ہی لوگوں کو اس کے آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے جنگلوں اور کھیتوں میں آگ لگا دی اور سلسلہ رسد منقطع کر دیا۔ نصر نے اس کی کوئی پروا نہ کی بلکہ بڑھتا چلا گیا اور فرغانہ کے ولیعہد کو ایک قلعے میں گھیر لیا۔ اور اس کے گرد محاصرہ کر کے اطمینان کے ساتھ ٹھیر گیا۔ ایک دن مسلمانوں کی غفلت میں کفار نے اچانک حملہ کر دیا اور مسلمانوں کے کچھ گھوڑے لے بھاگے۔

نصر نے ان کے مقابلے کے لیے بنی تمیم کے کچھ لوگ اور اُن کے ساتھ محمد بن مثنیٰ کو روانہ کیا۔ مسلمان روانہ ہوکر ایک کمین گاہ میں چھپ رہے۔ ترک حسب عادت نکلے اور چاہتے تھے کہ مویشیوں کو ہنکا لے جائیں کہ ایک بارگی مسلمان کمین گاہ سے نکل پڑے اور ایک سخت جنگ ہوئی جس میں مسلمان کامیاب رہے ؛

محاصرے کی پریشانیوں سے عاجز آکر اور مسلمانوں کی کامیابیاں دیکھ کر ولی عہد نے نصر سے صلح کی درخواست کی۔ نصر نے سلیمان بن صول کو نائب صلح دے کر ولی عہد کے پاس روانہ کیا۔ سلیمان جب قلعے کے اندر پہنچا تو اُس نے پہلے اپنے خزانے دکھلوائے۔ خزانے دیکھ کر سلیمان جب پلٹا تو ولی عہد نے اپنے پاس بلا کے پوچھا کہ ہمارے اور تمھارے درمیان راستہ کیسا ہے؟ سلیمان نے جواب دیا کہ بہت آسان ہے۔ جگہ جگہ پانی ہے۔ اور چراگاہیں بہ کثرت ہیں۔ ولی عہد نے پوچھا کہ یہ تم کو کیسے معلوم ہوا۔ سلیمان نے جواب دیا کہ میں غرشستان غور، ختل اور طبرستان پر حملے کر چکا ہوں۔ اور مجھے اس قرب و جوار کے سارے علاقے کا حال معلوم ہے۔ ولی عہد نے پوچھا اچھا یہ بتاؤ کہ ہماری تیاریاں اور مستعدی کیسی ہے؟ سلیمان نے کہا بہت اچھی ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں محصورین ہاتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اول یہ کہ وہ اپنے معتبر سے معتبر اور قریب سے قریب شخص پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ اپنے تمام جمع شدہ مال کو ضایع کر کے خود اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ہر وقت کی فکر سے وہ کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو کے مر جاتا ہے۔ ولی عہد نے سلیمان کی باتیں ناگواری کے ساتھ سنیں اور صلح کا شرایط نامہ مانگا۔ اُس کو پڑھ کے فوراً منظور کرلیا

اور تصدیق صلح کے لیے سلیمان کے ساتھ اپنی ماں کو نصر کے پاس بھیجا نصر کے خیمے کے پاس پہنچ کر ملکہ نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ نصر نے اس کو اجازت دی اور بڑی خاطر تواضع سے پیش آیا کیونکہ مسلمانوں میں اس ملکہ کی خاص عزت تھی۔ وہ نصر سے مختلف باتیں کرتی رہی اثنائے گفتگو میں اُس نے یہ کہا کہ ہر بادشاہ کے پاس جبتک یہ چھ چیزیں نہ ہوں وہ بادشاہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک وزیر جس سے وہ اپنے راز ظاہر کر سکے اور اس کی نصیحت پر عمل کرے۔ ایک باورچی کہ جب بادشاہ کا کھانے کو جی نہ چاہے تو ایسی چیز پکالے جس پر وہ خواہ مخواہ راغب ہوجائے ایک بی بی کہ جب لڑائیوں سے فرصت کر کے اُس کے پاس محل میں واپس آئے تو اس کے شگفتہ چہرے اور ناز و انداز سے اُس کا سارا رنج و غم کافور ہو جائے۔ ایک گھوڑا جو اُسے ضرورت کے وقت مصائب سے نجات دلا سکے۔ ایک تلوار کہ لڑائی کے وقت اُس کی بے وفائی کا خطرہ نہ ہو اور ایک خزانہ کہ اس کی مدد سے جہاں رہے خوش حال رہے۔ ان باتوں کے بعد معاہدہ صلح مکمل ہوا اور وہ واپس چلی گئی ؛

سنہ ۱۲۵ ہجری میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے وفات پائی اور ولید بن یزید کی بیعت لی گئی۔ ولید نے نصر کو بدستور خراسان میں قائم رکھا پھر عبدالملک کے لڑکوں میں باہم فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سنہ ۱۲۶ میں ولید بن یزید قتل کیا گیا اور یزید بن ولید کے لیے بیعت لی گئی۔ لیکن یزید چھ ماہ کے اندر ہی مرگیا تو اُس کے بھائی ابراہیم بن ولید کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ مگر ستر دن کے بعد ہی وہ معزول کر دیا گیا اور سنہ ۱۲۷ میں مروان بن محمد کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

مروان نے بھی نصر کو خراسان میں بدستور قائم رکھا۔ اور اُسی کے زمانۂ خلافت میں نصر نے خراسان میں انتقال کیا۔

مروان نے پانچ سال دس مہینے حکومت کی لیکن اس کو آرام سے ایک دن بھی بیٹھنا نہیں نصیب ہوا بلکہ برابر بنی عباس کی بڑھتی ہوئی قوت و سطوت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۳۲ھ میں مروان بعمر ۶۲ سال قتل کیا گیا اور اس کے قتل کے ساتھ ہی بنی اُمیّہ کی حکومت کا ورق اُلٹ گیا ؎

نصر بن سیار بنی اُمیّہ کے پُرجوش اور وفادار حامیوں میں تھا۔ وہ بڑا عقلمند اور دُور اندیش سردار تھا۔ اُس کی دوربین نظروں نے اس آنے والے انقلاب کو دیکھ لیا تھا اور وہ بہت دنوں پہلے ہی سے بار بار اپنے زمانے کے خلفا سے بنی اُمیّہ کو توجہ دلاتا رہا کہ خراسان میں اندر ہی اندر ایک ایسی آگ سلگ رہی ہے جو بہت جلد بھڑک اُٹھنے والی ہے اور اُس کے شعلے ایسے ہوں گے کہ بنی اُمیّہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر اُن خلفا نے اس کا زیادہ لحاظ نہیں کیا۔ آخر نتیجہ یہی ہوا کہ نصر کے مرنے کے دو سال بعد ہی بنی اُمیّہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا ؎

محمد بن تومرت

اور

موحدین کا آغاز

از ایڈیٹر

محمد بن تومرت سوس علاقہ مراکش میں پیدا ہوا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ میں علوی اور حسنی ہوں۔ مغرب میں اُس نے علوم حاصل کیے۔ پھر مشرق اور عراق میں آ کے یہاں کے مختلف علما کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ اِس کے اساتذہ میں امام غزالی بھی تھے۔ لیکن بعض اِس ضعیف قول کو غلط بتاتے ہیں۔

محمد بن تومرت نے کئی خواب دیکھے جن کی اُس نے یہ تاویل کی کہ مجھ کو اصلاح مسلمین کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ ایک دفعہ اُس نے خواب دیکھا کہ دو بار سمندر کا تمام پانی پی لیا۔

بعض لوگ لکھتے ہیں کہ محمد بن تومرت نجوم اور رمل سے واقفیت رکھتا تھا اور اِسی وجہ سے اس کو خیال پیدا ہوا کہ میں مہدی منتظر ہوں۔ اس خیال کو پہلے تو وہ چھپائے رہا لیکن بعد میں اس نے اعلان کر دیا اور اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ نماز روزے

اور عبادت و تقشف کا بہت گرویدہ تھا۔ اُس نے تبلیغ کی ابتدا یوں کی کہ پہلے پہل لوگوں کو بُری باتوں سے روکنے اور اچھی باتوں کی ہدایت کرنے لگا۔ اس طرح کچھ لوگ اُس کے معتقد ہو گئے جو اُس سے علوم حاصل کرتے اور اُس سے نصائح سنتے۔ ابتدائی معتقدین میں عبدالمومن بن علی اور ابوحفص عمر بن یحییٰ اور عبداللہ ونشریسی سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان میں سے آخرالذکر بہت بڑے ماہر علوم و فنون تھے۔ محمد بن تومرت نے اُن سے کہا کہ تم اپنا عالم و فاضل ہونا بالکل چھپا ڈالو اور گونگے بن جاؤ۔ تمہارا یہ کام ہے کہ اپنے شیخ کی خدمت کرو اور اپنے علم کو اُس وقت تک کے لیے چھپائے رکھو جب کہ یکبارگی معجزے کے طور پر اُس کا اعلان کیا جائے۔ ونشریسی اس حکم کی تعمیل میں بالکل گونگا بن گیا اور ایک دیوانے اور جاہل آدمی کی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔ ہر وقت اُس کی رال سینے پر بہا کرتی اور سوا اپنے شیخ کے جن سے تنہائی میں گفتگو ہوتی تھی کسی سے بات نہ کرتا

مراکش کا بادشاہ اس زمانے میں امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشفین تھا۔ محمد بن تومرت اور اُس کے ساتھی بھی مراکش کے قریب پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ چند عورتیں خچروں پر سوار جا رہی ہیں اور ان کے چہرے حسب عادت ڈھکے ہوئے نہیں۔ ان لوگوں نے بڑھ کے بعض خچروں کو مارا اور وہ بھڑکنے لگے اور ایک خچر پر سے ایک عورت گر پڑی یہ عورت امیر المسلمین کی بہن تھی۔ امیر المسلمین کو اس بے ادبی کی اطلاع پہنچی اور ساتھ ہی یہ بھی شکایت کی گئی کہ یہ شخص حکومت کے خلاف سازش کرتا پھرتا ہے۔ اُس نے محمد بن تومرت

اور اُس کے ساتھیوں کو پکڑ بلوایا - پھر دربار کے علما طلب کیے گئے اور ان لوگوں اور علما سے بحثیں ہوئیں - ابن تومرت نے نہایت موثر تقریر سے ان علما کو اُن کی غلطیوں اور منکرات کا ملزم ٹھیرایا - ساتھ ہی امیر المسلمین کی طرف متوجہ ہو کے نصیحتیں کرنے لگا اور کچھ اس انداز سے تقریر کی کہ امیر المسلمین کے آنسو نکل آئے - حضرت مالک بن وہیب جو امیر المسلمین کے حاضر باشوں میں بلکہ اُس کے وزیروں میں بڑے پرہیزگار عالم تھے یہ رنگ دیکھ کے بادشاہ سے کہنے لگے کہ میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں - اگر آپ اس کو قبول کر لیں تو اس کا نتیجہ بہت اچھا ہوگا - ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا - امیر المسلمین نے کہا وہ کیا ؟ تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو آپ کے متعلق اس شخص کی طرف سے بہت خطرہ ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ فتنہ اور بعض اطراف و اکناف پر غلبہ اور قبضہ ہے - اس لیے میری ذمہ داری پر آپ اس کو قتل کر ڈالیے - اگر آپ اس کو مارنا نہیں چاہتے تو مدت العمر کے لیے قید کر دیجیے -

لیکن بعض حاضرین دربار نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا امیر المسلمین کے لیے یہ بات کس قدر بری ہے کہ وہی شخص جس کی تقریر پر وہ ایک وقت رو چکے ہیں اُسی وقت اُسی مجلس میں اُس کے ساتھ برائی کریں اور اپنی اس عظمت اور شان کے باوجود وہ اس شخص سے ڈریں جو ایک فقیر آدمی ہے اور پیٹ بھر روٹی بھی نہیں کھا سکتا -

امیر المسلمین نے یہ گفتگو سُنی تو خاموش ہو رہے اور اس فتنے کو ہیچ سمجھنے لگے محمد بن تومرت کو اُنھوں نے واپسی کی اجازت دے دی اس سے اپنے لیے دعا کی خواہش کی۔

محمد بن تومرت نے باہر آتے ہی اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب تک مالک بن وھیب یہاں موجود ہیں ہمارا یہاں ٹھیرنا مناسب نہیں ۔ اور وہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر اغمات کی طرف چلا آیا ۔ اور عام لوگوں میں اپنے خیالات پھیلانے لگا ۔ وہ اپنے وزیر عبدالمومن بن علی کو لے کے بازاروں اور عام گزرگاہوں پر کھڑا ہو جاتا اور پُرجوش الفاظ میں نہایت آزادی کے ساتھ زمانے کی خرابیوں کی بُرائی کرتا ۔ وہ لوگوں کو شراب پینے اور دیگر ناجایز باتوں سے منع کرتا ۔ کیونکہ اس زمانے میں بہت سے لوگوں نے ان چیزوں کو اختیار کر لیا تھا ۔ نہایت جوش و خروش کے ساتھ وہ آلات موسیقی کو توڑ ڈالتا جو گانے والیوں کے ساتھ نظر آتے اور لوگوں کو گانا سُننے اور ناچ دیکھنے سے منع کرتا جو اس زمانے میں روزانہ عام گزرگاہوں اور بازاروں میں دیکھے اور سنے جاتے تھے۔

چند روز میں بے شمار لوگ محمد بن تومرت کا وعظ سُننے کے لیے جمع ہونے لگے ۔ اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور دور و دراز کے لوگ روزانہ اس کے پاس پہنچنے لگے ۔ اب یہ حالت ہوگئی کہ اس کے پاس ہر وقت پانچ سو آدمی ایسے جمع رہتے جو ہر حیثیت میں اس کی خدمت کرتے ۔ جہاں وہ جاتا اس کے ساتھ جاتے اور جو حکم دیتا اس کی تعمیل کرتے۔

جب اتنی قوت حاصل ہوگئی تو اُس نے مراد دین یعنی اُس ملک کے حاکموں کی لامذہبی اور اُن کی خرابیوں کا ذکر شروع کیا۔

وہ بادشاہوں اور سرکاری عہدہ داروں اور عوام سب کو یکساں آزادی کے ساتھ الزام دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس الزام کے کافی وجوہ بھی موجود تھے۔

محمد بن تومرت نے اس زمانے میں شہر سے باہر قبرستان میں ایک جھونپڑی بنالی تھی اور اُسی میں وہ اور اُس کے ساتھی رہا کرتے تھے۔ آخر کار محمد بن تومرت کی شہرت اور اُس کے ہمراہیوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی کہ شاہ علی بن یوسف کو اس بات کا خوف پیدا ہوا کہ اس کی کارروائیوں سے کہیں ملک میں شورش نہ پیدا ہو جائے۔ لہذا ایک قاصد کے ذریعے اُس کے پاس کہلا بھیجا کہ خدا کے قہر سے ڈرو اور لوگوں کو پریشان کرنا چھوڑ دو اور اِس شہر سے چلے جاؤ۔ محمد بن تومرت نے جواب دیا کہ میں نے آپ کے حکم کی اِس سے پہلے ہی تعمیل کر دی ہے اور شہر میں نہیں بلکہ مُردوں میں رہنے لگا ہوں۔ یہاں میں فقط آئندہ زندگی یعنے دوسرے عالم کا خیال کرتا ہوں اور بے دین گمراہوں کو حقارت کی نظر دیکھتا ہوں۔

یہ جواب سن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ محمد بن تومرت گرفتار کر لیا جائے اور اس کا سر اُڑا دیا جائے۔ مگر بادشاہ کا یہ حکم پوشیدہ نہیں رہ سکا۔ گرفتار کرنے والوں کے آنے سے پہلے ہی محمد تومرت کو خبر ہوگئی اور وہ اُن پہاڑوں کی طرف بھاگ آیا جن میں اس کے نہایت پُرجوش مددگار موجود تھے۔ اب اُس نے پہاڑی شہر تینمل میں اقامت اختیار کی اور یہاں وہ بہت محفوظ تھا۔ اُس نے آزادی کے ساتھ اپنے نئے اصول لوگوں میں پھیلا دیئے اور پہاڑوں کی وحشی قوموں نے اُس کے عادات واطوار کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیا کیونکہ اس نے اُنھیں لوگوں میں رہنا سہنا اختیار کر لیا تھا۔

چند روز کے بعد اُسے نظر آیا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مجھ کو اپنے ہمراہیوں کو مسلح کر دینا چاہیئے۔ لہذا ایک دن اپنے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کے اُس نے حسب ذیل تقریر کی۔

"الحمدللہ، وہ خدا جس کے سب احکام پورے ہوئے ہیں اور کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اُنھیں روک سکے اور نہ کوئی ایسا ہے جو اُس کے احکام کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ اور درود ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے امام المہدی کی نسبت بشارت دی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اسی کے ذریعے سے دنیا میں بجائے خرابیوں اور مظالم کے امن اور انصاف قائم ہوگا۔ لہذا اللہ تعالیٰ کو مناسب معلوم ہوا کہ اُس مہدی کو دنیا میں بھیجے۔ کیونکہ راستی جھوٹ کے سامنے دب گئی ہے اور انصاف کے بدلے مظالم پیدا ہو گئے ہیں۔ اور اچھے لوگوں کی جگہ ظالم اور بدکار آرام سے بیٹھے ہوئے مزے کر رہے ہیں۔ اس مہدی کے ظاہر ہونے کا زمانہ آ پہنچا ہے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ ایک قابل رہبر کی طرح لوگوں کی رہنمائی کرے اور اسی کام اور مقصد میں میں آج کل مصروف ہوں۔"

جیسے ہی یہ الفاظ ختم ہوئے محمد بن تومرت کے ہمراہیوں میں سے دس آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے جن میں اُس کا وزیر عبدالمؤمن بن علی بھی تھا۔ ان لوگوں نے کہا "اے ہمارے سردار اور آقا جو کچھ آپ نے کہا اور جو حال آپ نے مہدی موعود کا بیان کیا وہ آپ ہی کے متعلق ہے۔ آپ ہی ہمارے مہدی اور امام ہیں ہم آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور آپ کے فرمان بردار رہیں گے۔" یہ کہتے ہی اُنھوں نے محمد بن تومرت کے ہاتھ پر

بیعت کی۔ اس وقت یہ سب لوگ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم ہمیشہ آپ کے طرفدار رہیں گے۔ آپ کو بچائیں گے اور جو کوئی آپ کے حکم کے خلاف کرے گا اُس کے مقابلے میں لڑیں گے۔ اور ہمیشہ اس بات پر تیار رہیں گے کہ آپ کی خدمت گزاری میں اپنی جان دے دیں۔

ان دس آدمیوں کو دیکھ کے علاقۂ بربر کے دوسرے لوگ جو قریب کھڑے تھے انھوں نے بھی بیعت کی اور قسم کھائی کہ ہم اپنے امام کو دنیا بھر کے مقابلے میں بچائیں گے اور اُس کے حکم کے مطابق لڑیں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو اپنی جان تک دے دیں گے۔ اس بات کو ہم قبول کرتے ہیں کہ آپ ہمارے مہدی اور امام ہیں۔

یہ سب واقعات تینمل میں پیش آئے اور اب محمد بن تومرت کے پاس بہت سی خلقت جمع ہوگئی اور لوگ اُس کی باتیں توجہ سے سننے لگے۔ وہ اُن لوگوں کو نصیحت کرتا اور کہتا کہ ان حکومتوں میں سے کسی کی فرماں برداری ضروری نہیں کیونکہ وہ باطل کی پیرو ہیں۔ بلکہ اُن سے لڑنا اور اُن کو ظلم و ستم سے روکنا چاہیئے۔ ان باتوں سے متاثر ہوکر بہت سے قبائل بھی اُس کے ساتھ ہوگئے۔ محمد بن تومرت نے اپنی جماعت کا نام موحدین رکھا۔

امیرالمسلمین علی بن یوسف اس زمانے میں ہسپانیہ کی مہم میں مصروف تھا۔ جب اُس نے محمد بن تومرت کے یہ حالات سنے تو فوراً مراکش میں واپس آگیا اور مرابطی فوج کی ایک جماعت کو مہدی کے مقابلے پر بھیجا۔ قبیلۂ مصامدہ کے بیس ہزار آدمی سے زیادہ مہدی کے پیرو ہوگئے تھے۔ ان میں سے دس ہزار بہادر

کو اُس نے جنگی کاموں کے لیے منتخب کیا اور ایک سفید جھنڈا دے کر مرادین کے مقابلے کے لیئے بھیجا اور اُن سے کہہ دیا کہ تم کو یقیناً فتح ہوگی۔

امیرالمسلمین علی بن یوسف نے اِس مہم کا سردار والی سوس ابوبکر کو مقرر کیا اور وہ سردار بہت جلد باغیوں کی سرکوبی کے خیال سے روانہ ہوگیا۔ مگر جب دشمنوں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی فوج مقابلے کے لیے تیار کھڑی ہے اور اُس میں معزز خاندانوں کے لوگ اور فنون جنگ کے ماہر بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی فوج کو جنگی اصول سے مرتب کیا ہے۔ لہذا اُسے لڑائی لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوا اور اُس نے واپس آکر شاہ علی کو ان واقعات کی اطلاع دی۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ مہدی کے پاس فقط ذلیل اور کمزور لوگ نہیں ہیں بلکہ اُن میں جنگی ترتیب موجود ہے۔ یہ سُن کے بادشاہ نے حکم دیا کہ مزید فوجیں جمع کی جائیں۔ اب اُس نے ایک عظیم الشان فوج اپنے بھائی ابو اسحاق ابراہیم کے سپرد کی اور وہ باغیوں کے مقابلے کو چلا۔

ایک کھلے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور دونوں ترتیب جنگ سے آراستہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں اور لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ ناگاہ شاہی فوج میں خوف و اضطراب پیدا ہوگیا۔ اِس وقت تک یہ بات نہیں ظاہر ہوئی کہ شاہی فوج کی اگلی صفوں کے سپاہیوں نے کون سی ایسی چیز دیکھی جس سے وہ دفعۃً خوف زدہ ہو گئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگلی صفوں کے سپاہیوں اور سواروں نے جو سب سے

آگے تھے اپنے گھوڑوں کی باگیں پھیر دیں اور ان سبھوں نے میدان جنگ سے نہایت تیزی کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیا۔ انھیں دیکھ کر بقیہ فوج میں بھی بے ترتیبی ہوگئی اور وہ بھی گھبراہٹ کے ساتھ بھاگی

مہدی کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک لمحے کے اندر میدان جنگ دشمنوں سے صاف ہوگیا اور بغیر کوئی وار کیے شاہی فوجوں کو پوری شکست ہوگئی۔ مہدی کے لوگوں نے بڑھ کے دشمنوں کا تعاقب کیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بھاگنے والی فوج کے خیمہ و خرگاہ، تمام قیمتی چیزیں اور بے شمار ذخایر جنگ اُن کے قبضے میں آگئے۔

محمد بن تومرت نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جاؤ سلطانی فوجوں سے لڑو، تم کامیاب ہوگے۔ خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا۔ اس کرامت کی وجہ سے لوگوں کا اعتقاد مہدی کے متعلق بہت مضبوط ہوگیا۔ اب ہر طرف سے قبائل اُس کے پاس آتے اور اُس کے ہاتھ پر بیعت کرتے جاتے

محمد بن تومرت نے اپنے طرفداروں کے لیے ایک کتاب توحید کے متعلق لکھی جس کا نام مرشد رکھا۔ اور ایک کتاب عقائد پر تصنیف کی۔ پھر ان لوگوں کو ایک دوسرے کے ادب کے طریقے بتائے اور نہایت مختصر اور کم قیمت کپڑے پہننے کا حکم دیا۔ اور دنیا کی محبت سے روکا۔ وہ خود اسقدر سادہ زندگی بسر کرتا کہ چوبیس گھنٹے میں اس کے لئے ایک موٹی روٹی اور تھوڑا سا تیل کافی تھا۔

وہ برابر اپنے مقلدوں کو دشمنوں سے لڑنے اور بُرے لوگوں کو اپنی جماعت میں سے نکالنے کا خیال دلایا کرتا۔ اِدھر اس کا اثر یوں بڑھ رہا تھا اُدھر دور اندیش اور عقلمند اہل قبائل لوگوں کو اِس کی اطاعت سے روکتے اور سلطانی قوت کا خوف دلاتے

ابن تومرت کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں یہ لوگ میرے ساتھیوں پر یورش نہ کر دیں یا دھوکے سے ہم سب کو سلطان کے حوالے نہ کر دیں۔ اُس نے اُن لوگوں کی تلاش شروع کی جو اپنے لڑکوں اور قبیلوں کو اُس کی اتباع سے روکتے تھے اور ایک رجسٹر میں اِن کے نام درج کرتا جاتا۔ اِس کی مخبر عبداللہ ونشریسی کے سوا اور کسی کو نہ تھی۔ اور وہ اسی خاص دن کے لئے گونگا بنایا گیا تھا۔ جب تمام مخالفین کے نام معلوم ہو گئے تو اُس کی خاموشی کے ختم ہونے کا دن آیا۔ محمد بن تومرت نے اُس سے کہا کہ اب تم ایک ترکیب کرو۔ اور عبداللہ ونشریسی نے اسی مشورے پر عمل کیا۔

ایک دن محمد بن تومرت صبح کی نماز کو نکلا تو اُس نے محراب کے پاس ایک شخص کو اچھے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے کھڑے پایا۔ وہ اِس طرح اُس کو دیکھنے لگا گویا بالکل نہیں جانتا تھا اور تجاہل عارفانہ سے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس شخص نے خود ہی بڑھ کے جواب دیا کہ میں ونشریسی ہوں۔ مہدی نے تعجب سے کہا کہ تم تو گونگے تھے پھر بولنے کیسے لگے؟ ونشریسی نے جواب دیا کہ رات کو میرے پاس آسمان سے ایک فرشتہ آیا اور اُس نے میرا دل دھو کر قرآن شریف اور مؤطا اور دیگر علوم اور احادیث سب مجھے بتا دیئے۔ یہ جواب سُن کر مہدی نے بناوٹ سے بہت تعجب کیا پھر وہ رونے لگا اور بولا کہ ہم تیرا امتحان لیں گے۔ اس نے کہا بہتر۔ پھر جس مقام سے اس کو حکم دیا گیا وہاں سے قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھنے لگا۔ اِس کے بعد اُس سے مؤطا اور کتب فقہیہ و اصول کے متعلق سوالات کئے گئے اور

اُس نے سب کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور اس کی خاص عظمت اُن لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ پھر ونشریسی نے لوگوں سے کہا کہ مجھ کو خدا نے ایک ایسا نور دیا ہے جس سے میں بتا سکتا ہوں کہ کون جنتی ہے اور کون اہل نار ہے۔ میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ دوزخیوں کو قتل کر ڈالو اور اہل جنت کو چھوڑ دو۔ دیکھو فلاں مقام کے کنوئیں میں خدا نے کچھ فرشتے اُتار دیئے ہیں جو میری صداقت کی تصدیق کریں گے ان ظالموں نے اُس کنوئیں میں پہلے ہی سے کچھ لوگ چھپا دئے تھے مہدی اور اُس کے ساتھ کچھ اور لوگ روتے ہوئے کنوئیں کے پاس پہنچے۔ یہاں مہدی نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا" اے اللہ کے فرشتو خدا کے بندے ونشریسی کا اپنے متعلق ایسا ایسا خیال ہے۔ کیا یہ صحیح ہے ؟" کنوئیں سے آواز آئی وہ سچا ہے۔ یہ جواب سُنتے ہی مہدی نے کہا کہ یہ کنواں نہایت مقدس اور پاک ہے اِس میں ملائکہ اُترے ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ اِسے پاٹ دیا جائے تاکہ اس میں کوئی نجاست نہ ڈال سکے اور اس کی بے حرمتی نہ ہو۔ اس ہدایت کا صرف یہی منشا تھا کہ اس کی مکاری اور راز لوگوں سے چھپا رہے اور وہ لوگ جو اس کی کیفیت سے واقف ہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیئے جائیں۔ لوگوں نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا اور مٹی اور پتھر ڈال ڈال کے اُسی وقت اُن لوگوں کو جو کنوئیں کے اندر تھے دفن کر دیا۔

اب مہدی نے لوگوں کو اُسی جگہ بلانا شروع کیا اور وہ کل کے کل اہل حق و باطل کے امتیاز کے لیے جمع ہو گئے جو شخص اُن لوگوں میں سے آتا جس کو مہدی نے خطرناک لوگوں کی فہرست

میں لکھ رکھا تھا ونشریسی کہتا یہ اہل نار میں سے ہے اور وہ اُسی وقت قتل کر ڈالا جاتا۔ اور جو شخص ایسا آتا جس کا نام اُس فہرست میں نہ تھا وہ چھوڑ دیا جاتا۔ یہ کارروائی کئی دن جاری رہی اور وہ سب لوگ قتل ہوگئے جن سے مہدی کو خطرہ تھا۔

تاریخ کامل ابن اثیر میں ہے کہ اس طرح ستر ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اور باقی لوگ خلوص دل اور صدق نیت سے اُس کے تبع ہوگئے۔ مہدی نے پھر اپنے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا اے موحدین، مراودین (یعنے وہ لوگ جو ملک پر حاکم تھے) تمہارے متعلق کیا کہتے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ وہ ہمیں ذلیل کرنے کے لئے کہریش (یعنے گمراہ اور بے دین) کہتے ہیں۔ مہدی نے کہا تو تم انہیں سراقین کہہ سکتے ہو کیونکہ درحقیقت وہی سچے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ اسی موقع پر مہدی نے مراودین کو مخاطب کرکے ایک خط لکھا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

اُس قوم کے نام جسے شیطان نے گمراہ کر دیا ہے اور جس سے خدا ناراض ہے یعنے دشمن جماعت تمیلہ لمتونہ والو۔ تم لوگ سمجھو کہ ہم وہی چاہتے ہیں جو خود اپنے لوگوں سے۔ اور تمہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیتے جو خود اپنے لوگوں کو دیا کرتے ہیں یعنے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اُس سے ڈرو اور اس کی عبادت میں مشغول رہو تاکہ تمہیں اس کا علم رہے کہ دنیا کس طرح پیدا کی گئی ہے۔ اور یہ بات کہ جنت اُن لوگوں کے لیے ہے کہ جو خدا سے ڈرتے اور اُس کی عبادت کرتے ہیں اور جہنم کی دائمی تکلیفیں اُن لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہیں جو خدا کی قدرت کے قائل نہیں ہیں

یا اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔ شریعت اسلامی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اس بات کو سچ جانو کہ ہم تمہارے اصلی حاکم ہیں۔ اگر تم ہمارے حق کو قبول کرتے ہو اور اطاعت گزاری کے لئے آمادہ ہو تو سلامت رہو گے۔ لیکن اگر ایسا نہ کرو گے تو یقین جانو کہ ہم تمہارے خلاف جنگ کریں گے، تمھیں قتل کریں گے تمھاری املاک کو تباہ و برباد کر دیں گے اور تمھارا نام صفحہ ہستی سے بالکل مٹا دیں گے۔ اس کام میں خدا کا نہ نظر آنے والا بازو ہماری مدد کرے گا۔ ہم تمھارے گاؤں کو جلا دیں گے اور تمھارے سب شہر ویران کر ڈالیں گے۔ غرض تمہارا یا تمھارے رہنے کے مقاموں کا کوئی نشان تک نہ باقی رہنے پائے گا۔ ہم تمھیں پہلے سے آگاہ کیے دیتے ہیں کہ تمھیں کیا کرنا چاہیے اور جو شخص پہلے سے آگاہ کر دیتا ہو اُسے بعد میں کسی قسم کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ ہم تمھیں سلام نہیں بھیجتے ہیں کیونکہ شریعت نے ہمیں اس کی اجازت دی ہے لیکن ہمیں اس کی اجازت دی ہے کہ تم سے دوستی قائم کریں۔

موحدوں کی فتوحات سے شاہ علی بن یوسف کو بہت فکر پیدا ہوئی اور اب وہ نہایت رنجیدہ اور غمگین ہو گیا۔ کیونکہ اُسے کامیابی اور انتقام لینے کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تھی۔ ہر وقت وہ اسی فکر میں مصروف رہتا کہ کس طرح دشمنوں کو تباہ کیا جائے اور کس طرح انھیں شکست دی جائے۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ اُس نے پھر فوجیں جمع کر کے باغیوں کے مقابلے پر بھیجیں۔ یہ فوجیں تعداد میں باغی فوجوں کے برابر تھیں۔ اور ایک خونریز لڑائی ہوئی مگر دشمنوں نے جن کے پاس نہایت عمدہ اور مرتب رسالے موجود تھے پھر مرابطین کو شکست دے دی۔ اب شاہی فوج میں دشمنوں کا ایسا خوف پیدا ہو گیا کہ وہ باغیوں کے مقابلے کی جرأت ہی نہ کرتے

المہدی نے اتنی فتوحات حاصل کرلیں کہ کوئی انتہا نہ تھی۔ مراودی سپاہیوں کے دلوں میں یہ بات جم گئی تھی کہ اس لڑائی میں ہم کسی طرح کامیاب نہیں ہوسکتے اور دشمن فتح پائیں گے۔

مورخ الزہیری جو اس زمانے میں مراکش میں مقیم تھا لکھتا ہے کہ میں نے ایک نہایت آراستہ فوج کو موحدین کے مقابلے پر جاتے ہوئے دیکھا۔ موحدین اس زمانے میں پہاڑوں میں تھے۔ شاہی فوج کا سپہ سالار بادشاہ کا بھائی ابوطاہر تمیم تھا۔ یہ مورخ بیان کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان فوج دشمنوں کی تلاش میں پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔ جب سپاہی پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے اور مہدی کے لوگ اُنھیں اُوپر سے نظر آ رہے تھے شہزادۂ تمیم نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنی فوج کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ مختلف راستوں سے پہاڑ کے اُوپر جائیں۔ اتفاقاً اُس وقت جب کہ وہ نہایت دشوار گزار گھاٹیوں میں جا رہے تھے رات ہوگئی۔ اب اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں لہذا فوجی ترتیب بگڑ گئی اور بہت سے لوگوں کے پیر پھسل گئے جو چٹانوں کے اوپر سے نیچے گرنے لگے۔ سوار اور پیدل سب اس تباہی میں مبتلا تھے۔ وہی مورخ بیان کرتا ہے کہ اس عظیم الشان فوج کو بغیر لڑے بھڑے شکست ہوگئی۔

شاہی فوج کی تباہی مقام تینج کے قریب واقع ہوئی اب موحدین بھی پہاڑوں کی بلندیوں پر سے اُتر آئے اور اس تباہ حال اور بے ترتیب فوج کا تعاقب کرنے لگے جو شہزادہ تمیم کی ماتحتی میں واپس ہو رہی تھی۔ یہ غنیمت ہوا کہ مدینۂ اغمات سے ایک نئی مرابطی فوج مدد کے لئے آگئی اور کوہستان عاقبہ کے قریب مراودین نے باغیوں

گیا مگر شاہی فوجوں کو شکست ہوگئی اور ایسی سخت خونریزی ہوئی کہ بہت کم لوگ تھے جو زندہ بچ کے مراکش میں واپس آئے ۔

اس فتح کے بعد مہدی پہاڑوں سے اتر آیا اور تینمل میں چلا گیا ۔ اب یہیں اُس نے مستقل اقامت اختیار کرلی کیونکہ یہ قلعہ ایسا مضبوط اور ایسی جگہ پر بنایا گیا تھا کہ خواہ کتنی ہی فوج اُس کے مقابلے کو آئے مگر فتح نہیں کر سکتی تھی ۔ اس مقام کو مستقل طور پر اپنے رہنے کے لئے منتخب کرکے اُس نے اپنے ہمراہیوں کے لئے زمینیں تقسیم کیں ۔ اس کے بعد شہر کے گرد ایک نہایت مستحکم شہر پناہ تعمیر کرائی جس میں بہت سے اونچے برج تھے ۔ ایک بہت بلند مقام تجویز کرکے اُس نے ایک قلعہ بنایا جس کی فصلیں غیر معمولی طور پر مستحکم تھیں ۔ اس کے برجوں پر سے سارا شہر ہی نہیں نظر آتا بلکہ چاروں طرف کے میدان بھی دور دور تک دکھائی دیتے ۔ غرض تینمل ایک ایسا مضبوط قلعہ اور شہر ہوگیا کہ کوئی دوسرا مقام اُس کی مضبوطی کو نہ پہنچ سکتا ۔ کوئی شخص خواہ سوار ہو یا پیدل دو پھاٹکوں کے سوا اور کسی طرف سے شہر میں نہ داخل ہو سکتا ۔ ایک پھاٹک مشرق کی جانب دوسرا مغرب کی جانب ۔ مغربی پھاٹک مراکش کی طرف واقع ہوا تھا ۔ دونوں پھاٹکوں کا راستہ تنگ وادیوں میں سے ہوکے گزرتا تھا جو اس قدر دشوار گزار تھیں کہ گھوڑے بہت مشکل سے اُن میں گزر سکتے ۔ جو شخص شہر میں داخل ہونا چاہتا اُس کے لئے ضروری تھا کہ اپنے گھوڑے پر سے اتر پڑے اور نہایت احتیاط کے ساتھ قدم رکھتا ہوا چلے تاکہ کسی گہرے غار میں نہ جا پڑے ۔ یہ تنگ راستہ سخت چٹانوں میں کاٹ کے بنایا گیا تھا جن کے ایک جانب بہت گہرا غار تھا اور دوسری جانب پہاڑ بہ

کی اونچی چوٹیاں تھیں۔ اس تنگ راستے سے گزرنے والے کو جا بجا تیز رو ندیاں ملتیں جو پہاڑ کی چوٹیوں پر سے آئی تھیں اور جن میں بڑے بڑے ناہموار پتھر تھے۔ اِن ندیوں اور نالوں کے اوپر لکڑی کے پل رکھ دیئے گئے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو نہایت آسانی کے ساتھ علیحدہ کر دیئے جاتے۔ اُس حالت میں یہ رستہ بالکل ناقابل گزر ہو جاتا اور وہ شخص جو اُس جگہ پہنچ جاتا نہ آگے بڑھ سکتا اور نہ واپس جا سکتا۔ دونوں پھاٹکوں کی جانب ان تنگ گزرگاہوں کا سلسلہ پورے ایک دن کی مسافت تک چلا گیا تھا۔

شہر اور قلعۂ تینمل کو اِس طرح مستحکم کر لینے کے بعد اپنی فوجیں قرب و جوار کے ممالک پر حملہ کرنے کے لئے بھیجیں۔ یہ فوجیں پہاڑوں پر سے جاڑوں کی طوفانی ندیوں کی طرح اُتریں اور شاہ علی کے قصبوں اور شہروں میں پھیل گئیں۔ بادشاہ نے اپنے سپہ سالاروں سے مشورہ کیا کہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے اور کس طرح ان پر حملہ کیا جائے کہ وہ اپنے پہاڑی گھونسلے تینمل کے اندر بند ہو جائیں۔ پھر ایک فوج جمع کی گئی اور ایک ہسپانی شخص فلکی کو اس کا افسر مقرر کیا گیا۔ اِسے بعض لڑائیوں میں کامیابی حاصل ہوئی مگر مہدی کی فوجوں کو کوئی بڑی شکست نہیں ہوئی۔ اب اُس نے ایک بہت بڑی جرأت کی اور ارادہ کیا کہ پوری قوت کے ساتھ شاہ علی کی فوجوں کا مقابلہ کرکے اُس کے دارالسلطنت مراکش پر قبضہ کرے۔ اس خیال سے اُس نے اُن قبائل کو جو اُس کے مطیع ہو گئے تھے یہ لکھا کہ اپنی فوجیں جمع کریں اور تینمل کی فوج میں شامل ہو جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں بہت جلد ایک بہت بڑی فوج ہر طرف سے آ گئی۔ اس میں سوار بھی تھے اور

پیدل بھی - اور اسلحہ کا ایک بہت اچھا ذخیرہ موجود تھا - شیخ ابو محمد البشیر کو اُس نے اِس فوج کا سپہ سالار اعظم مقرر کر کے حکم دیا کہ خاص دارالسلطنت مراکش کی جانب روانہ ہو جائے - یہ فوج مراکش کے قریب پہنچ گئی اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہر پر قابض ہو جائے گی مگر مرابطین نے جان پر کھیل کے ایسا سخت حملہ کیا اور ایسی جرأت اور استقلال سے کام لیا کہ موحدین کو شکست ہو گئی - اب مرابطین نے تعاقب کر کے موحدین کو قتل کرنا شروع کر دیا - اس لڑائی میں چالیس ہزار آدمی نذر اجل ہو گئے - اور موحدین کے سارے پیدل اور رسالوں میں سے فقط چار سو آدمی اپنی جانیں بچا سکے -

اس خونریز لڑائی میں موحدین کا سپہ سالار ابو محمد بشیر بھی مارا گیا - اس شکست میں موحدین کا ایک شخص بھی اپنی جان نہ بچا سکتا لیکن بہادر اور عقلمند سردار عبدالمومن بن علی نے انتہائی جرأت اور بہادری سے کام لیا جس کی دوست اور دشمن سب تعریف کرتے تھے - اُس نے حکمت عملی اور جرأت کے ساتھ اپنی فوج کے اتنے آدمیوں کی جانیں بچا لیں یہی بڑا کارنمایاں تھا - جب مہدی نے اس تباہ کن شکست کی خبر سُنی تو اُس نے کسی قسم کا رنج اور افسوس نہیں ظاہر کیا - جو لوگ اس شکست کا حال بیان کر رہے تھے اُن سے مہدی نے پوچھا کہ سب کچھ ہوا مگر یہ بتاؤ کہ عبدالمومن تو نہیں مارا گیا؟ اُنھوں نے جواب دیا نہیں - مہدی نے کہا تو پھر کوئی پروا نہیں - اگر عبدالمومن زندہ ہے - تو ہماری سلطنت بھی ضرور باقی رہے گی - اور خوب ترقی کرے گی -

من آنم کہ من دانم

یعنی

مولانا شرر مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری

"آپ بیتی"

ولادت سن صبیٰ اور لکھنؤ کی ابتدائی تعلیم

جس زمانے میں منشی قمرالدین صاحب انگلستان میں تھے اور مولوی تفضل حسین صاحب لکھنؤ میں پریشان حال تھے بروز پنجشنبہ ۱۷۔ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۲۷۶ھ (م ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء) کو میں پیدا ہوا۔ میری ولادت لکھنؤ کے محلہ جھوائی ٹولہ کے متعلق تکیہ پیر غیب کے مشرقی جانب ایک مکان میں ہوئی جو اُسی تکیے کی مسجد کے مقابل ایک چھوٹے چار پانچ مکانوں کے احاطے کے اندر واقع تھا۔ اور تابوجی کا پھاٹک کہلاتا تھا۔

یہ مکان منشی قمرالدین صاحب کے منجھلے بھائی مولوی غنی الدین مرحوم کا تھا جس میں اُن کی بیوہ، میرے والدین، میری دادی اور والد کے چچا مولوی احمد صاحب جنھوں نے سفر سے واپس آکر ترک تعلق کر دیا تھا سکونت پذیر تھے۔

والد مرحوم اِس بے کاری کے زمانے میں منشی عبدالحی صاحب سندیلوی سے خطاطی اور خوشنویسی سیکھتے اور حکیم محمد ابراہیم صاحب

تحصیل فن طب کرتے تھے۔ میری عمر پانچ چھ برس کی ہوگی کہ منشی قمرالدین صاحب نے اُن کو ٹیا برج میں بلاکر بادشاہ کے وہاں محرروں میں بیس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھوا دیا۔

مجھے اپنا بچپن دو ڈھائی برس کی عمر سے کچھ کچھ یاد ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ بچپن میں میں اکثر بیمار اور سخت امراض میں مبتلا رہا۔ ہیضون ورم و ضعف معدہ [illegible] رہتا۔ یونانی اطبا کا علاج تھا۔ فاقے پر فاقے دلوائے جاتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک ایک منقے کے چار ٹکڑے طاقوں پر رکھ دئے جاتے۔ اور عورتیں جو مجھے گود میں لئے بہلاتی پھرتی تھیں ان طاقوں کے پاس لے جاتیں اور مجھے وہ منقے کا ٹکڑا جو سرسوں کے دانے کے برابر ہوتا نعمت عظیم نظر آتا۔

اُس عہد کے واقعات سے مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں نہایت ہی بیوقوف تھا۔ عورتیں مجھے بہت ہی بھولا لڑکا بتاتیں۔ اور واقعی اب میں جہاں تک حافظہ پر زور ڈالتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ لڑکوں کی سی ہوشیاری اور چالاکی کا مجھ میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ بیماری میں مجھے مونگ کی کھچڑی دی جاتی۔ میں اُس کے ساتھ گھی مانگتا۔ عورتیں ایک چمچے میں پانی لاکے کھچڑی پر رکھ دیتیں اور میں اُسے گھی مان لیتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرا دل تو اُسے گھی نہ مانتا مگر مروت کی کمزوری باور کراتی کہ بزرگوں کا کہنا غلط نہیں ہو سکتا۔ اور اس اخلاقی کمزوری کو میں آج تک اپنی طبیعت میں نمایاں پاتا ہوں۔

یہ مصیبتیں جھیل کے میں چھ سال کا ہوا تو والد کی غیبت میں جو کلکتے میں تھے اپنے نانا منشی قمرالدین صاحب کے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین صاحب کے پاس مکتب میں بٹھایا گیا جنھوں نے بعد

انتزاع سلطنت اپنے گھر کے دروازے میں ایک مکتب کھول کر لڑکوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا اور اسی پر بسر کرتے تھے۔ اُن کا یہی مکتب آج میری لائبریری خلوت گاہ اور میرا کتب خانہ ہے۔

میں اس مکتب کے بڑے لڑکوں کی صحبت میں شریک ہونے کے قابل نہ تھا۔ وہ تین چھوٹے بچے جو ادنیٰ پیشہ وروں کے تھے میرے انیس و ہمدم تھے اور پڑھنے میں میں اس درجہ کند ذہن اور بد شوق تھا کہ استاد علامہ کی تعلیم کا مطلق اثر نہ ہوا۔ والد مرحوم ایک بار کلکتے سے آئے تو میں پارۂ عم میں سورۂ والشمس پڑھ رہا تھا۔ تین سال بعد آئے تب بھی مجھے وہی سورۂ پڑھتے دیکھا اور سمجھ لیا گیا کہ میں نہایت ہی کند ذہن لڑکا ہوں۔ لیکن آج جو میں اپنی اُس حالت پر غور کرتا ہوں تو اس تعلیمی نالائقی کا باعث اُس وقت کا خراب طرز تعلیم تھا۔

مولوی حفیظ الدین صاحب اوپر کی کتابیں پڑھنے والے ہوشیار لڑکوں کے لئے جتنے اچھے مدرس تھے اتنے ہی چھوٹے بچوں کے لئے برے۔ میں بد شوق تھا اور پریشان خیال۔ پڑھتا کتاب کو اور دل کہیں اور ہوتا۔ ان عیوب کے مٹانے کی تدبیر وہ لانا نہ جانتے تھے۔ مجھے دو ہی تین سال اس حالت اور اس مکتب میں گزرے تھے کہ والد مرحوم نے مجھے کلکتے بلوا لیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر میں کلکتے جانے سے پیشتر کے اپنے لکھنؤ کے پہلے دور زندگی کا کچھ حال بیان کر دوں مجھے خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ میرے تمام اعزہ شریف نیکوکار اور متقی و پرہیزگار لوگ تھے۔ اور ہمارا اہل علم و فضل لوگوں کا تھا جن کو پڑھنے پڑھانے کے سوا اور کسی

کام سے سروکار نہ تھا۔ ان میں سے اکثر کا پیشہ اور ذریعۂ معاش تعلیم دینا تھا؛

تکیہ کے مشرقی کنارے پر میرے مکان کے قریب ہی عزیزوں کے چار مکان تھے۔ ایک مولوی محمد رضا کا جو فارسی کے مشہور و مستند مدرس تھے۔ دوسرا حکیم احمد رضا کا جو مذکورۂ بالا بزرگ کے چھوٹے بھائی تھے اور فن طب حاصل کرنے کے بعد ٹیابرج کلکتے میں جا کے بادشاہ کے وہاں طبیبوں میں نوکر ہو گئے تھے۔ اور "ناصر المعالجین" خطاب پایا تھا۔ تیسرا مولوی ریاض احمد صاحب کا جو والدہ کے حقیقی ماموں اور بڑے سچے اور کھرے بزرگ تھے۔ وہ بھی ٹیابرج میں ملازم تھے۔ چوتھا مولوی عبدالاحد صاحب کا جو فارسی کے اچھے مدرس تھے۔ نابینا ہو گئے تھے مگر کتابیں ایسی مستحضر تھیں کہ زبانی پڑھاتے اور معلوم ہوتا کہ کتاب کے صفحے پیشِ نظر ہیں۔ انھوں نے آخر عمر میں ایک مطبع جاری کیا تھا اور کتابوں کی تجارت کرتے تھے۔ ان کے بیٹے مولوی عوض علی صاحب جن کو میں ماموں کہتا تھا بڑے درشت مزاج بزرگ تھے وہ ہمیشہ میلوں اور تماشا گاہوں میں مجھے اور بہت سے لڑکوں کے ساتھ سیر کرانے کو لے جاتے۔ اور نہایت شاکی تھے کہ کئی بار میں کھو گیا۔ اور بڑی مشکلوں سے اپنے ولیوں اور بزرگوں کو کوتوال شہر کی دھمکیاں برداشت کرنے کے بعد ملا۔

اسی زمانے میں پہلے پہل مجھے لارڈ لارنس کا آنا اور ان کے جلوس کا نکلنا خوب یاد ہے۔ میں نخاس کی سڑک پر کسی دکان میں بٹھا دیا گیا۔ سامنے بہت سے گوروں کے رسالوں اور ان کے بعد ہاتھیوں کے جلوس کا گزرنا جن پر گنگا جمنی عماریاں تھیں خوب

یاد ہے ۔ میری بچپن کی سادی آنکھوں نے اس جلوس اور کروفر کو بڑی حیرت سے دیکھا ۔

ان چار مکانوں کے علاوہ تین عزیزوں کے گھر کٹرہ بزن بیگ خاں میں تھے ۔ ایک میرے نانا منشی قمرالدین صاحب کا جس میں مولوی حفیظ الدین صاحب کا مکتب تھا ۔ اور یہی میرا نانہال تھا ۔ دوسرا منشی قمرالدین صاحب کے چھوٹے بھائی حافظ محمد بخش کا جو عام طور پر ولی کامل مانے جاتے ۔ اور ایسے زبردست عامل تھے کہ اُس زمانے کے لوگوں نے اس پائے کا صاحب قدرت عامل دور دور تک نہیں سنا تھا ۔ اُن کے تصرف کے صدہا قصے آج تک مشہور ہیں ۔ تیسرا منشی عبدالمجید صاحب کا جو مستند خوشنویس اور اُستاد زمانہ پیراک تھے ۔ بکریوں کا بے حد شوق تھا ۔ گھر بکریوں سے بھرا تھا ۔ اور اُن کا سارا وقت اُنھیں کی خدمت و زینت میں صرف ہوتا ۔ اور اُن کی خصوصیات میں سے یہی ایک چیز مجھے یاد ہے ۔

میرے مکان کے پاس تابوجی کے پھاٹک کے اندر معزز کشمیری پنڈتوں کے تین مکان تھے ۔ جن کی عورتیں اکثر میرے گھر میں موجود رہتیں اور سنتا ہوں کہ میرا رضاعت کا زمانہ زیادہ تر اُنھیں کے آغوش میں گزرا ۔ ہمارے پچھواڑے میر پنجو نام ایک صاحب کا گھر تھا جن کے یہاں گوٹا بُننے کا کارخانہ تھا ۔ اُن کے مکان کا دروازہ دوسرے محلے میں تھا ۔ مگر ہمارے اُن کے مکانوں کے درمیان کھڑکی تھی ۔ اُن کی بیوی کو میں چچی کہتا اور جب چلنے کے قابل ہوا تو زیادہ تر اُنھیں چچی کے ساتھ رہتا ۔ محرم میں اُنکے یہاں تعزیہ داری ہوتی ۔ اور اُن کے محلے کی تمام عورتیں ماتم کرنے کو اُن کے یہاں آتیں اور وہ

ماتم کرنے کو اُن کے گھروں میں جاتیں اِن ماتموں میں اُنھیں کے ساتھ گھر گھر پھرتا اور آدھی رات کے بعد گھر میں آ کے سو رہتا۔

مذکورہ عزیزوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں جتنے چھوٹے لڑکے تھے سب میرے ساتھ کھیلنے والے تھے۔ جن میں سے مولوی ریاض احمد صاحب کی لڑکیاں، مولوی محمد رضا صاحب کے پوتے اور مولوی عبد الاحد صاحب کے پوتے اور نواسے میرے خاص انیس وہمدم تھے۔ لیکن مجھے کبھی تنہا گھر سے نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ ایک کولن عورت جو گیہوں بیں لاتی تھی وہ میری نگراں تھی۔ اسی کے ساتھ میں اپنے عزیزوں کے گھر میں جاتا۔ یا یوں کہیئے کہ گھر سے باہر قدم نکالتا۔ گھر کے اندر میرا کھیل یہ تھا کہ ایک چھوٹے سے کھٹولے پر بیٹھ کے کاغذوں پر لکیریں کھینچا کرتا۔ جس سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ لکھنا میرا فطری اور ابتدائی شوق تھا۔

اُس وقت کے دوستوں میں سے افسوس کہ اب کوئی نہیں باقی رہے اور نہ اُس وقت کا کوئی عزیز زندہ ہے۔ یوں ہم لوگوں کو اِکا دُکا کبھی کبھی مرتے دیکھتے ہیں اور بہ ظاہر نظر آتا ہے کہ بہت کم لوگ مرتے ہیں۔ مگر اپنے اُس عہد زندگی کے اعزہ واحباب کو یاد کرتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ ایک خدائی کی خدائی دنیا سے چلی گئی۔ اور وہ محلہ جو تکیے کے نیچے سفرق کی جانب آباد تھا اور نالص مسلمانوں کا محلہ تھا بالکل دنیا سے غائب ہوگیا۔ جو کشمیری پنڈت تھے وہ ترقی کرکے آباد محلوں میں چلے گئے۔ جتنے مسلمان خاندان تھے سب فنا ہوگئے، بعض خاندانوں کی نسلیں ہی منقطع ہوگئیں اور جن کے چند لڑکے تھے وہ بے تعلیمی اور افلاس سے بدکار شہدے ہوگئے۔ قید ہوئے، ذلیل ہوئے اور آخر لاولد

مرگئے یا کسی طرف بھاگ گئے۔ اور پتہ نہ لگا کہ کیا ہوئے اور نہ کہاں گئے۔ اب اُن کی جگہ چند ادنےٰ درجہ کے مزدور نہ پیشہ اور مفلوک الحال پڑے ہوئے ہیں جو اور محلوں سے آکے بسے ہیں۔ ہاں کٹرہ ہزن بیگ خاں البتہ آباد ہے۔ مگر اس میں بھی جتنے مسلمانوں کے مکان تھے اُن میں سے اکیلا میرا مکان باقی ہے باقی سب ہندوؤں کے مکان ہیں اور اِس سرے سے اُس سرے تک کلیتہً ہندو محلہ ہے۔ اور شاید ہندوؤں ہی کی خوش اقبالی سے یہ محلہ ابھی تک آباد ہے۔

باقی آئندہ

"Registered No. B-3126"

رجسٹری شدہ سرکار عالی نمبر ۱۲۴

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم و مغفور

کی یادگار

رسالہ

دلگداز

نمبر ۳ بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء جلد ۳۲

مرتبہ

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

مطبع دلگداز اورنگ آباد دکن میں چھپا

اور باہتمام ایڈیٹر مذکور شائع ہوا

سالانہ چندہ (عہ) سکہ انگریزی مع محصول ڈاک

کارخانہ روغن آریا حین لکھنؤ کا اعلیٰ عطر

(آپ ایک دفعہ آزما کے تو دیکھیں)

عطر کے لئے لکھنؤ مشہور ہے مگر افسوس کہ جو عطر ہو وہ باہر والوں کو نہیں ملتا۔ یہ حال دیکھکر ہم نے اراہ کیا ہے کہ باہر کے جو صاحب طلب فرمائیں اُن کے لئے معتبر اور مستند کارخانوں کے عطر اعلیٰ درجے کے تیل وغیرہ خاص اہتمام کرکے مال تجربی جانچ کے روانہ کردیا کریں۔

عطر کے شائق

ایک بار امتحاناً خوشگوار تجربہ فرمائیں۔

عطروں کی فہرست حسب ذیل ہے

عطر حنا فی تولہ	عہ، للعہ، ے، ؏، عیہ	عطر باڑی فی تولہ	؏، عیہ	عطر مٹی	فی تولہ
" موتیا "	عہ، للعہ، ؏، عہ	" بیلہ "	ے، ؏، عیہ	" برگ حنا	"
" چنبیلی "	ے، عہ، للعہ، ے، ؏	" مجموعہ "	؏، عیہ، عہ	" باڑی	
" کیوڑا "	للعہ، ے، ؏، عیہ	" جوہی "	؏، عہ	" سہاگ	"
" خس "	؏	" سنگترہ "	؏، عیہ	" مہک پری	"
" حفنہ	للعہ، ے، ؏، عیہ	" چمپا "	؏، عیہ	" شہنانہ "	ے
" مولسری "	للعہ، ے، ؏، عیہ	" کیوڑی "	؏، عیہ	" شمامۃ العنبر "	ـ
" محبوب پسند "	[illegible]	" اگر عرقی کہنہ "	ـعہ ـعہ	" روح گلاب اصلی	ما، ـعہ
" [illegible] "	ے، عہ، للعہ	" نافہ کیسر "	عہ، للعہ	" اگر کہنہ	ـعہ ـعہ
" مخلوط شفق "	؏	" مخلوط عنبری "	ے	" گلاب "	ـعہ ـعہ

خوشبودار تیلوں کی فہرست ملاحظہ ہو

روغن چنبیلی فی سیر ے، للعہ، ؏	روغن بیلہ فی سیر ـعہ، للعہ، ؏	روغن کیوڑہ فی سیر ـعہ، للعہ، ؏	روغن حنائی [illegible]

اعلیٰ درجے کا خوشبودار عمدہ اور بامزہ تمباکو

تمباکو مشکی فی سیر [illegible]	قوام تمباکو مشکی فی تولہ [illegible]	گولیاں تمباکو مشکی [illegible]
" زعفرانی " ؏	" زعفرانی " [illegible]	" نقرئی " [illegible]

نوٹ۔ درخواست آنے پر ویلیو ایبل روانہ ہوگا۔ محصول ڈاک وغیرہ ذمہ خریدار۔

پتا: خادم حکیم محمد سراج الحق خیر اللہ کٹرہ دین بیگ خاں

مہابت خان

از

(جناب حکیم محمد سراج الحق صاحب)

اصلی نام زمانہ بیگ تھا باپ کا نام غیور بیگ کابلی ہے جس کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ رضا تک پہونچتا ہے۔ اس کا بیٹا خانہ زمان اس نسب نامہ کے ساتھ لکھتا ہے کہ میرے جملہ آبا و اجداد بزرگ و صاحب ثروت تھے۔ غیور بیگ شیراز سے آکر کابل میں مرزا محمد حکیم کا ملازم ہوا۔ اور محمد حکیم کے انتقال کے بعد عرش آشیانی اکبر کی ملازمت میں منسلک ہوکر چتوڑ کی لڑائی میں کارہائے نمایاں بجا لایا۔

زمانہ بیگ کا ہنوز بچپن ہی تھا کہ شہزادہ سلیم کے احدیوں میں داخل ہوگیا۔ سلیم نے اس کی خدمات پسند کرکے منصب کے ساتھ اپنے شاگرد پیشوں کا بخشی بنا دیا۔ جس زمانے میں سلیم الہ آباد کی فرمانروائی کر رہا تھا راجہ اوجینیہ ایک ایسی بڑی جماعت کے ساتھ جس نے اپنے ورود سے شہر کے علاوہ قرب و جوار کے سارے جنگل اپنے پڑاؤ سے بھر لئے بعد عہد و پیمان کے شہزادے کی ملازمت کو حاضر ہوا۔

جب دربار میں آتا تو اپنے ساتھ اس قدر آدمی لاتا کہ سارے دربار میں تل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ سلیم کو اس کی یہ حرکت شاق گذرتی مگر اُس سے کچھ کہہ نہ سکتا۔ ایک رات کو خلوت میں سلیم نے راجہ کی اس بیہودہ حرکت کا تذکرہ کرکے فرمایا کہ اس گنوار راجہ کی کچھ فکر کرنا چاہیئے۔ زمانہ بیگ نے عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو تو اسی وقت جاکر اس کا کام تمام کردوں۔ سلیم نے اشارہ کیا اور یہ اپنے خدمتگار کے ساتھ آدھی رات گذرنے کے بعد راجہ کے مکان پر پہونچا۔ راجۂ مذکور نشہ میں مست راؤٹی میں سو رہا تھا۔ اس نے راؤٹی کے دروازہ پر اپنے خدمتگار کو کھڑا کرکے راجہ کے آدمیوں کو اشارے سے بلایا اور اُن سے کہا کہ شہزادے نے ایک ضروری مخفی پیام راجہ صاحب کے پاس بھیجا ہے لہذا تم لوگ یہاں سے ہٹ کر دور چلے جاؤ جب پہرہ دار ہٹ گئے تو اس نے اندر جاکر راجہ کا سر کاٹ کر دوشالہ میں باندھا اور باہر نکل کر پہرے والوں سے ہدایت کی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں کسی شخص کو راجہ کے پاس نہ جانے دینا۔ پھر بے کھٹکے راجہ کے مکان سے نکل کر سلیم کے پاس آیا اور راجہ کے سر کو اُس کے قدموں پر ڈال دیا۔

سلیم یہ بہادری دیکھ کر عش عش کر گیا اور اسی وقت اسے مہابت خاں کا خطاب دے کر راجہ کے لشکر پر چھاپہ مارنے کا حکم دیا۔ راجہ کے آدمی اس شبخون سے پریشان ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور اُس کا کل مال و اسباب ضبط ہو کر شہزادے کے خزانے میں داخل ہوا۔

جب سلیم جہانگیر کے نام سے بادشاہ ہوا تو اسے سہ ہزاری

منصب عطا کیا پھر اودے پور کے رانا کی سرکوبی کو بھیجا۔ اس مہم کی واپسی پر شہزادہ خرم کے ساتھ دکن کی مہم پر روانہ کیا گیا ۱۰۲۶ھ ۱۶۱۷ء میں اپنی خدمات کے صلے میں کابل کی حکومت سے اختصاص پایا۔ یہاں تھوڑے ہی دنوں رہا تھا کہ اعتماد الدولہ کے تسلط کی وجہ سے جو اس کے ساتھ دلی خصومت رکھتا تھا اسے اپنی عافیت اسی میں نظر آئی کہ شاہ عباس سے خط و کتابت کر کے اس کے پاس چلا جائے اور جب یہ مرحلہ بحسن وجوہ انجام پا گیا تو اس نے عراق جانے کی طیاری کر دی مگر خانزماں خانہ زاد خاں نے اپنی حسن تدبیر سے اس کے آدمیوں کو متفرق کر کے اسے فسخ عزیمت پر مجبور کیا۔

۱۰۳۱ھ ۱۶۲۲ء میں جب نورجہاں کے اغوا سے جہانگیر اور شاہجہاں میں صفائی نہ رہی اور جنگ و جدال کی نوبت پہنچی تو یہ اس مہم کے سر کرنے کے واسطے کابل سے طلب کیا گیا۔ ابتدا میں اسے آصف خاں کی دشمنی کی وجہ سے نورجہاں پر اعتبار نہ آیا مگر جب اس نے حلفیہ عہد و پیمان کر کے آصف خاں کو آگرہ بھجوا دیا تو یہ حاضر دربار ہو گیا۔ جہانگیر نے ابتدا میں شاہجہاں کی تخریب کے واسطے آصف خاں کو بڑی فوج دے کر روانہ کیا مگر اس کے لشکر کے ہراول کا سردار عبداللہ شاہجہاں کی فوجوں سے جا ملا تو جہانگیر نے یہ امر آصف خاں کی شازش پر محمول کر کے اسے واپس بلا لیا اور اسے اس مہم پر تعینات کیا۔ اس نے فوج کا جایزہ لیتے ہی خانخاناں کی وساطت سے شاہجہاں کو یہ عریضہ ارسال کیا کہ اگر حضور میرا قصور معاف کر کے مجھے اطمینان دلائیں تو خدمات شائستہ بجا لاؤں مگر ان خدمات کی انجام دہی کے واسطے

ضروری ہے کہ فی الحال حضور بساط منازعت کو طے کرکے مانڈو تشریف لے جائیں اِس مدت میں یہ غلام حضور کا قول قدیم بحال کرا کے اور بادشاہ کی دستخط و مہر ثبت کراکے روانہ کر دے گا۔

شاہجہاں جسے ہر طرح باپ کی اطاعت مد نظر تھی خانخاناں کی تحریک سے مانڈو چلا گیا۔ اب پرویز الہ آباد سے آیا اور اس نے دیگر واقعہ طلبوں سے ملکہ جہانگیر کو ایسا غیشہ میں اتارا کہ وہ لشکر کے ساتھ خود اجمیر گیا اور وہاں سے پرویز کو سارے لشکر پر سردار کرکے اس کی اتالیقی میں شاہجہاں کی مہم پر روانہ کیا شاہ جہاں مانڈو سے برہان پور اور برہان پور سے تلنگانہ ہوتا ہوا بنگالہ گیا اور اِس نے پرویز کے ساتھ برہان پور میں ٹھہر کر دکن پر حکمرانی شروع کی۔ اسی درمیان میں بذریعہ شاہی فرمان اسے اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں بنگالہ کے صوبہ دار کو شکست دے کر الہ آباد کی جانب آرہا ہے لہذا دکن کا انتظام کسی دوسرے شخص کو سپرد کرکے مع شاہزادے و شاہی لشکر کا اس طرف روانہ ہو۔ فرمان قضا تشیم پاتے ہی اس نے سلاطین دکن سے صلح کرکے اور محمد عادل شاہ کے وکیل ملا محمد لاری کو سر بلند راے کی نگرانی میں چھوڑ کر پرویز کے ساتھ عین موسم برسات میں نارہ کا رتیلا میدان طے کرتا ہوا سارے اشنائے شاہی کے ساتھ الہ آباد آیا اور شاہ جہاں کو شکست دے کر بنگالہ کی جانب بھگا دیا۔

اس زمانے میں اس کی طرفداری کی وجہ سے عادل شاہ اور ملک عنبر میں لڑائی ہو گئی۔ ملک عنبر نے عادل شاہ کے ساتھ

شاہی لشکر کو بھی شکست دی اور علاقہ شاہی میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگا۔ شاہ جہاں بنگال سے بھاگ کر اس طرف آیا تو ملک عنبر و عادل شاہ نے استقبال کر کے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس نے ملک عنبر اور یاقوت خاں حبشی کی فوج لے کر برہان پور کا محاصرہ کر لیا۔ آگرہ میں یہ خبریں پہونچیں تو مہابت خاں پھر مع شاہی لشکر و پرویز کے اس مہم کے واسطے بنگالہ سے طلب ہوا۔ یہ بموجب حکم دکن جا رہا تھا کہ سارنگ پور میں فدائی خاں نے اس مضمون کا شاہی فرمان پہونچایا کہ خانجہاں صوبہ دار گجرات اس کے بجائے پرویز کا اتالیق مقرر ہوا اور یہ بنگالہ جا کر وہاں کا انتظام کرے۔ شہزادہ پرویز اس ردو بدل پر راضی نہ ہوا تو دوسرے فرمان کے ذریعہ سے اطلاع دی گئی کہ اگر مہابت خاں بنگال جانا نہیں چاہتا تو حاضر دربار ہو اور خانہ زاد خاں صوبہ دار کابل بجائے اپنے باپ کے کابل سے جا کر بنگالہ کا انتظام کرے۔

آصف خاں کو جو مدت دراز سے اس کی فکر میں تھا اپنا سابقہ کینہ نکالنے کا موقعہ ملا اور اُس نے اس فرمان کی تعمیل میں دیر ہوتی دیکھ کر ایک ہزار احدی سواروں کے ساتھ عرب دست غیب کو فرمان مذکور کی زبردستی تعمیل کرانے کے واسطے دکن روانہ کیا۔ دوسرا شاہی فرمان پاکر مہابت خاں اور نیز پرویز کو عذر و معذرت کرنے کی جرأت نہ ہوسکی اور یہ مجبور ہوکر برہان پور سے روانہ ہوا شاہزادہ پرویز بطور مشایعت ایک منزل تک اس کے ساتھ آیا اور دو دھو کر اسے رخصت کیا۔ اس رخصت کے وقت اس نے خبر سمیدار اسپنے ساتھ لینا چاہے تو فاضل خاں دیوان دکن نے چلا کر کہا کہ نہ

شاہی معتوب ہے کوئی شخص اس کا ساتھ نہ دے۔" فاضل خاں کے ان کلمات کا اس نے یہ جواب دے کر کہ شاہی متصدیوں نے بادشاہ کے مطلب کو غلط سمجھا ہے اور آخر میں انہیں ذلت اٹھانا ہوگی۔ آگے کی راہ لی۔

رنتھمبور پہونچ کر اس نے اپنے انجام پر غور کرکے فوج بھرتی کرنا شروع کی۔ یہ حال سن کر رانا اودے پور نے اپنے ایک ہزار جنگ آزما راجپوت اس کے پاس بھیج دیئے اور اس سے اسے کافی تقویت ہوگئی۔ ابھی اس کے منشا کے مطابق کافی فوج بھرتی نہ ہوئی تھی کہ عرب دست غیب مع اپنے سواروں کے آپہونچا۔ اس نے اس کی صورت دیکھتے ہی کہا کہ "جس کام کو تو آیا ہے میں اس سے بخوبی واقف ہوں مگر اس کا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال میں خود ہی تیرے ساتھ چلوں گا۔" پھر چھ ہزار سوار جن میں دو ہزار مسلمان اور چار ہزار راجپوت تھے اپنے ساتھ لے کر چل کھڑا ہوا۔

جس زمانے میں جہانگیر کابل کی سیر کو جا رہا تھا اس کی حاضری کی اطلاع ہوئی حکم ہوا کہ تا اداے مطالبہ بادشاہی وجواب جاگیرداران بنگالہ جن کا مال تو نے زبردستی ہضم کیا ہے ملازمت میسر نہ ہوگی۔ اسی کے ساتھ اسے اپنے مخبروں سے معلوم ہوا کہ آصف خاں نے یہ طے کیا ہے کہ جس دریاے جھٹ کے کنارے منزل ہو شام کو سارا لشکر مع فوج کے دریا پار اتر جائے اور جہانگیر معمولی پہرے والوں کے ساتھ اسی پار شب باش ہو علی الصباح مہابت خاں بتقریب ملازمت طلب کیا جائے اور جہانگیر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کشتی پہ بٹھا کے دریا پار لیئے چلا آئے پھر پل توڑ کر مہابت خاں کی

فوج کا راستہ روک دیا جاسکے

منزل شاہ آباد میں بھجت خاں داروغہ فیل خانہ اس کے پاس پہنچا اور حکم دیا کہ اس مدت میں تو نے جس قدر ہاتھی جمع کئے ہیں سرکار میں داخل کر۔ اس نے چند نامی ہاتھی اپنے پاس رکھ کر باقی اس کے حوالے کئے۔ یہ امر اسے ناگوار گزرا اور اس نے جھنجھلا کر کہا کہ "خانجیو" یہ ہاتھی کس دن کے واسطے رکھ چھوڑے ہیں آپ کی کشتی حیات تباہ ہو چکی ہے اور وہ دن قریب ہے کہ اگر لڑکے زندہ بچ جائیں گے تو جوار کی روٹی کو محتاج ہوں گے" بھجت خاں نے ہنس کر جواب دیا "تو کیا اُس وقت آپ ہماری مدد نہ کریں گے" پھر کہا کہ ان ہاتھیوں کو چھوڑ کر جلدی چلے جاؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے یہ گنوار راجپوت تمہاری ان باتوں سے ناراض ہو کر کہیں تم پر حملہ نہ کر دیں۔ یہ سُن کر بھجت خاں اُن ہاتھیوں کو لے کر چلا گیا۔ اور اس نے اپنے تئیں موت کے منہ میں دیکھ کر اپنا اثاثہ سپاہیوں کو بطور پیشگی دے دیا اور ان سے اپنی مدد کا حلفیہ عہد و پیمان لیا۔

شاہی عساکر دریائے بھٹ کے کنارے مقیم ہوئے اور آصف خاں بموجب اپنی قرارداد سابقہ کے کل فوج و خدمتگاران شاہی کو اس پار لے گیا اور پہر رات جانے کے بعد سوا چند خاص لوگوں کے جہانگیر کے پاس کوئی باقی نہ رہا۔ مہابت پہلے ہی سے اس موقع کا منتظر تھا اس فرصت کو غنیمت سمجھا اور اپنے ایک ہزار

سوار پو پھٹنے سے قبل پل کی حراست کو بھیج کر شہزادہ شہریار و داور بخش کو گھیر لیا اور انہیں اپنے ہمراہ لے کر غسل خانہ (دیوان خاص) کا دروازہ توڑ کر دولت خانہ شاہی میں پہونچا پھر اپنے ملازموں کو دروازہ پر بٹھا کر جہانگیر کے سامنے آیا اور بعد ادائے آداب شاہی عرض گزار ہوا کہ غلام آصف خاں کے پنجے سے اپنی رہائی ناممکن سمجھ کر اس جسارت کا مرتکب ہوا ہے اب جو سیاست حضور مناسب سمجھیں اپنے ہاتھ سے عمل میں لائیں۔ اس موقع پر چند راجپوت سے اس کے ساتھ غسل خانہ میں گھس آئے تو مقرب خاں سے بروئے قدیم مہابت خاں سے ڈانٹ کر کہا کہ "اے کوڑھی یہ کیسی بے ادبی ہے" اس نے بجائے اس کے کہ کچھ جواب دے اپنی لکڑی اس زور سے ماری کہ پیشانی تشقے کی طرح کھل کر لہو سے تر بتر ہو گئی۔ اس مختصر مدت میں جہانگیر نے دو مرتبہ شمشیر کے قبضے پر ہاتھ ڈالا مگر ہر مرتبہ میر منصور بدخشی ترکی زبان میں مانع ہو کر عرض پیرا ہوا کہ یہ وقت حوصلہ آزمائی کا نہیں ہے۔ مصلحت سے کام لیجئے۔

مہابت خاں نے عرض کیا کہ اس واقعہ سے بڑا آشوب اٹھ کھڑا ہوا ہے اس وقت حضور کا سوار ہونا مناسب ہے پھر اصرار کر کے اپنے ہاتھی پر سوار کیا۔ اس وقت گجپت خاں داروغہ فیل خانہ شاہی سواری کی خاص ہتھنی پر بطور مہاوت کے بیٹھ کر اور اپنے لڑکے کو خواصی میں بٹھا کر قریب آیا تو مہابت خاں سے ڈپٹ کر کہا کہ بدھو! یہ وہی دن ہے کہ میرے لڑکے مسلمانوں کی دلی کو محتاج ہونے والے تھے۔ راجپوتوں نے اشارہ کیا

اور انھوں نے ان باپ بیٹوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر جہانگیر کو اپنے گھر لے گیا اور اپنے لڑکوں سے نذریں پیش کرا کے اور بادشاہ کے گرد پھرا کر زر و جواہر تصدق کرایا۔ یہاں خود اِس نے اور اِس کے لڑکوں نے کوئی طریقہ ایثار کا اُٹھا نہ رکھا۔ اتفاقاً جہانگیر کو [illegible] آئی تو اسے نورجہاں کا خیال آیا اور یہ سوچ کر کہ وہ وہاں [illegible] ہے جہانگیر کو سوار کرا کے شہریار کے گھر لے گیا۔ مگر اِس فرصت میں بیگم نکل چکی تھی اور یہ اپنی غفلت پر ہاتھ مل کر رہ گیا ❊

نورجہاں یہاں سے بھاگ کر شاہی لشکر میں پہونچی تو امرا کو ملامت و سرزنش کر کے جہانگیر کی رہائی کے واسطے فوج مرتب کی۔ مہابت خانی راجپوتوں نے شاہی فوج کو اِس طرف آتے دیکھا تو پل توڑ دیا۔ آخر نورجہاں نے مجبور ہو کر یہ مرحلہ پایاب جگہ کی تلاش میں دوسرے روز کے واسطے اُٹھا رکھا۔ صبح ہوئی تو نورجہاں خود سپہ سالار بنی اور سارے لشکر کو لے کر دریا کے اندر اُتری اُس کا یہ عزم دیکھ کر راجپوتوں نے دوسری جانب ہاتھیوں کی صفیں کھڑی کر کے اِن کا راستہ روکا۔ ابھی شاہی لشکر نصف دریا بھی نہ طے کر چکا تھا کہ فریق مخالف نے تیروں کی بوچھار کر کے اسے برہم کر دیا۔ بہت سے کچھ دلے بھاگے اور گہراؤ میں پڑ کر اپنی جان سے گئے۔ بیگم صاحبہ کا ہاتھی بھاگ کر بہ مشکل کنارے لگا۔ اور وہ دو مردوں کی مدد سے اپنے خیمے تک پہنچیں ❊

آصف خاں مع اپنے لڑکوں کے جان بچا کر اٹک [illegible] بڑے بڑے سرداروں نے جدھر راستہ پایا فرار ہوئے۔ دوسرے دن نورجہاں کے ساتھ بقیہ شاہی سردار مہابت خاں سے عہد و پیمان

کر کے جا ملے۔ اور اُس کی ملامت کا ہدف بنے۔ اب مہابت خاں جہانگیر کی سواری اسی شان سے لئے ہوئے اٹک گیا اور آصف خاں و ابوطالب و خلیل اللہ وغیرہ کو گرفتار کر کے مہمات سلطنت خود انجام دینے لگا اور اپنے راجپوتوں کو ہدایت کی کہ جہانگیر کی نگہبانی دیکھیں

جب جہانگیر کی سواری اس شان سے کابل پہونچی اور وہاں قیام ہوا تو ایک دن چراگاہ کے متعلق شاہی احدیوں اور راجپوتوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اتفاقاً اس جھگڑے میں ایک احدی کام آیا تو سب احدیوں نے جمع ہو کر راجپوتوں کے گروہ کے گروہ قتل کر ڈالے۔ اور جو لوگ ان احدیوں کے ڈر سے بھاگے وہ کابلیوں کے ہاتھ میں پڑ کر قتل ہوئے یا غلام بنا کر فروخت کیے گئے۔ مہابت خاں یہ واقعہ سن کر راجپوتوں کی کمک پر پہنچا مگر اس وقت یہ ہنگامہ سر سے گزر چکا تھا اور نورجہاں کے اشارے سے سارا لشکر احدیوں کی مدد کر رہا تھا۔ مجبور ہو کر جہانگیر کی پناہ میں آیا۔ جہانگیر نے اس فتنے کو دبانے کے واسطے کوتوال کو بھیجا اور اُس نے محض اس کی خاطرداری کے خیال سے چند احدیوں کو اسیر کر کے اُس کے حوالے کر دیا۔ مگر اس واقعہ سے مہابت خاں کی مہابت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہی۔ اس واقعہ نے اسے سخت توہم میں ڈال دیا اور یہ ابھی ہنگامہ پر جہانگیر کی اس حراست کا انجام سوچنے لگا۔ اب اسے نظر آیا کہ یہ حراست جہانگیر کی نہیں بلکہ خود میری حراست ہے جو زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی۔ رہا جہانگیر کا قتل اس پر اس کا دل آمادہ

نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے علیحدہ رہنے کی ٹھان لی۔

اب جہانگیر کابل سے واپس ہوا تو رہتاس گڑھ میں نورجہاں بیگم کا خواجہ سرا ہوشیار خاں بیگم کے حکم سے دو ہزار سوار لے کر حاضر ہوا۔ اس موقعہ پر فوج کی دکھلائی کے بہانے سے ساری فوج مسلح کی گئی۔ یہ مسلح لشکر منزل بہ منزل واپس ہو کر اسی جگہ پر پہنچا جہاں سے یہ مصیبت شروع ہوئی تھی۔ یہاں اس سے جہانگیر نے فرمایا کہ کل نورجہاں کی فوج کا جائزہ لینا ہے اور تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ قیامت کی پتلی ہے ممکن ہے کہ عین موقع پر اپنی فوج والوں سے کچھ جھگڑا فساد کرا دے لہذا تم اپنے لشکر کے ساتھ ایک منزل آگے بڑھ جاؤ۔ یہ متوہم تو ہو ہی چکا تھا اور جہانگیر کی ایسی حراست سے جس میں ہر وقت اپنی جان کا کھٹکا لگا رہتا تھا بے فائدہ سمجھ کر عاجز ہو رہا تھا بموجب اس کے حکم کے آگے بڑھ گیا۔ یہاں اسے بذریعہ فرمان شاہی اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں ٹھٹھہ پر حملہ کر رہا ہے اس کی سرکوبی پر مع اپنی فوج کے روانہ ہو۔ یہ آصف خاں وغیرہ کو قید سے چھوڑ کر اس طرف روانہ ہوا تو نورجہاں نے ایک تیز رو قاصد کو بھیج کر شاہ جہاں کو اطلاع دی کہ مہابت خاں تمھاری فکر میں آ رہا ہے تم دکن کو واپس جاؤ۔ اس خط کے ساتھ ہی شاہ جہاں کو پرویز کی موت کی اطلاع ملی اور وہ اسے لطیفہ غیبی سمجھ کر گجرات ہوتا ہوا دکن روانہ ہوا۔ مہابت خاں بے نیل و مرام واپس ہو کر جیسلمیر کے علاقہ تک پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ شاہی فوج میری گرفتاری پر متعین ہوئی ہے مجبور ہو کر رانا اودے پور سے مدد کا خواہاں ہوا۔ رانا اودے پور نے ہمدردی

نہ کی تو اپنے دو ہزار جانباز راجپوتوں کو لے کر گجرات اور اُودے پور کی سرحد پر مقیم ہوا۔ شاہ جہاں سے خط وکتابت شروع کی اور جب شاہ جہاں نے اس کی گستاخیوں کو معاف کر کے اطمینان دلایا تو یکم صفر ۱۰۳۶ھ کو اس کے پاس چلا گیا۔

اسی زمانے میں جہانگیر نے انتقال کیا اور شاہ جہاں تخت نشینی کے ارادے سے گجرات ہوتا ہوا اجمیر میں وارد ہو کر فاتحہ پڑھنے کو حضرت خواجہ صاحب قدس سرہ کے مزار پر انوار پر حاضر ہوا۔ دوران فاتحہ میں مہابت خاں مصحف پاک کو خواجہ صاحب کی قبر کے تعویذ پر رکھ کر شاہ جہاں سے عرض گزار ہوا کہ غلام نے حضور کے بادشاہ ہونے کی منت مانی تھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ درجہ اجابت کو پہنچی۔ اب اگر حضور بموجب قول خود میری تقصیرات معاف فرما چکے ہیں تو اس مصحف پاک کی قسم کھا کر ان خواجہ بزرگوار کو درمیان میں دیجئے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اسی وقت مجھے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مرحمت فرمایئے۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ کل آصف خاں حاضر ہو کر میرے خون کو حلال کر دے گا۔ شاہ جہاں نے یہ کلمات سُن کر اسے تسلی وتشفی دی اور بعد جلوس خانخاناں سپہ سالار کے خطاب کے ساتھ چار لاکھ روپیہ نقد بطور انعام اور منصب ہفت ہزاری و ہفت ہزار سوار اجمیر کی صوبہ داری مرحمت فرما کر معزز [illegible] گیا۔

جب آصف خاں حاضر دربار ہوا تو اسے دکن کا صوبہ دار بنا کر اس طرف بھیجا اور اس کے لڑکے خانزماں کو مالوہ کا صوبہ دار مقرر کر کے اس کا نائب بنایا۔ مگر اس تقرر کے دوسرے سال

دکن کے بجائے دہلی کا صوبہ دار ہوا اور سنہ ۱۰۴۱ھ میں اعظم خاں کے بجائے ہمیشہ
کے واسطے دکن کی صوبہ داری مرحمت ہوئی۔ دکن پہنچا تو یہ معلوم کر کے
کہ جس وقت سے یہ علاقہ شاہی قبضے میں آیا ہے ہمیشہ غلے کی عسرت
میں مبتلا رہتا ہے اور کسی صوبہ دار نے اب تک اس جانب توجہ
نہیں کی ہے اس طرف متوجہ ہوا اور بنجاروں کی ایسی خاطر داشت
کی کہ وہ لاکھوں من غلہ لانے لگے اور اس کا سارا علاقہ غلے کی
ارزانی کے واسطے مشہور ہو گیا؛

اسی زمانے میں ساہو بھونسلہ نے عادل شاہ سے مل کر فتح خاں
سے جو نظام شاہی کے آخری بادشاہ کا کار پرداز تھا قلعہ دولت آباد
چھین لینا چاہا تو اس نے نظام شاہی امرا کو اپنے موافق نہ دیکھ کر
خانخانان سپہ سالار سے استدعا کی کہ قلعے میں کھانے پینے کا
سامان نہیں ہے اگر آپ جلد تشریف لے آئیں تو میں یہ قلعہ بندگان
شاہی سے منسلک کر دوں۔ یہ اطلاع پاتے ہی اپنے بیٹے خانزمان
کو اس طرف روانہ کیا اور خود بھی کچھ اور فوج فراہم کر کے
اسی سمت چلا۔ خانزمان نے دولت آباد پہنچتے ہی ساہو بھونسلہ
اور اندولہ خاں کو شکست دی اور چھ کوس تک تعاقب کر کے
ان کے ہزاروں آدمی قتل کیے؛

مگر اسی درمیان میں فتح خاں نے عادل شاہیوں سے صلح کر کے
خانخانان سپہ سالار سے نقض عہد کیا۔ اسے فتح خاں کی بد عہدی پر
سخت غصہ آیا اور باپ بیٹوں نے مل کر دولت آباد کا محاصرہ کر لیا۔
اس محاصرہ کی خبر سن کر ساہو بھونسلہ اور اندولہ خاں کے لشکر بھی واپس
آئے اور شاہی لشکر پر اندر و باہر دونوں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ

ہونے لگی مگر اس نے ثابت قدمی سے محاصرہ نہ چھوڑا اور تھوڑے دنوں کے بعد دشمنوں کو شکست دی۔ قلعے کے اندر غلہ بالکل باقی نہ تھا اور لوگوں کا گزر مردہ جانوروں کے گوشت پر تھا اس موقع پر اندودہ خاں کے چچا اور عادل شاہ کے آدمیوں نے جو قلعہ کے اندر تھے اماں طلب کی۔ پھر اماں پانے پر رات کی تاریکی میں کمندوں کے ذریعہ نیچے اتر کر خانخانان کو سلام کرتے ہوئے بیجاپور سدھارے

ان کے جانے کے بعد مراری پنڈت نے جو بیجاپور کی سلطنت کی مہمات کا مالک تھا عادل شاہیوں کے ساتھ نظام شاہیوں کو بھی اکٹھا کر کے ایلورہ میں آیا اور اندولہ خاں و ساہو بھونسلہ کو خانزماں کے مقابلے میں مستعد کر کے خود یاقوت خاں کے ساتھ خانخانان سپہ سالار سے ہم نبرد ہوا۔ اس موقع پر بہت بڑا معرکہ پیش آیا۔ مگر آخر میں دشمن شکست کھا کر بھاگے اور یاقوت خاں حبشی اس بھگدڑ میں قتل ہوا بعض مورخ اس جنگ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اس سے قبل دکن میں ایسی قیامت خیز جنگ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ خانخانان فتح و نصرت سے ہمرکاب ہو کر قلعے کے نیچے آیا اور سرنگ میں آگ دینا چاہی فتح خاں نے اس ارادے سے خبردار ہو کر کہلا بھیجا کہ میں عادل شاہیوں سے قسم کھا کر اقرار کر چکا ہوں کہ بغیر تمہاری صلاح کے صلح نہ کرونگا لہذا آج کے دن نقب میں آگ لگانا موقوف رکھیے۔ خانخانان سپہ سالار نے جواب دیا کہ اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو اپنے لڑکے کو بطور ضمانت میرے پاس بھیج دے فتح خاں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا تو بعد انتظار نقب میں آگ دے دی گئی۔ آگ لگتے ہی ایک

قیامت خیز دھماکے ادھر ہی چل کے ساتھ قلعہ کا ایک برج مع پندرہ گز دیوار کے آسمان کی جانب اُڑا اور جیسے ہی گرد و غبار سے مطلع صاف ہوا شاہی بہادر قلعہ میں گھس کر ملک الموت کا کام کرنے لگے۔
فتح خاں نے اپنی عزت و آبرو کا خیال کر کے اپنے بڑے بیٹے عبدالرسول کو بھیج کر اظہار ندامت کے ساتھ اپنے قصوروں کی معافی چاہی۔ اور ایک ہفتہ کی مہلت اپنا مال و اسباب اٹھا لے جانے کی طلب کی۔ خانخانان سپہ سالار نے اس موقع پر صرف مہلت ہی نہیں دی بلکہ ڈھائی لاکھ روپیہ نقد کے ساتھ اپنے ہاتھی و اونٹ اور دیگر لوازم بار برداری بھیج کر اس کا اسباب اٹھوا دیا۔ فتح خاں نے اپنا اسباب نکلوانے کے بعد قلعہ کی کنجی دے کر سارے دولت آباد پر شاہی قبضہ کرا دیا۔ نوابِ فتح دولت آباد آمد تاریخ ہوئی۔
۱۰۴۳

خانزمان سپہ سالار نے نظام شاہی علاقہ کا انتظام کر کے دولت آباد میں خان دوران نصیری خاں کو مرتضیٰ خاں و سید نظام پسر میراں صدر جہاں پہانوی کے ساتھ چھوڑ کر نظام الملک کو ساتھ لے کر جو ایک خرد سال لڑکا تھا مع فتح خاں کے برہان پور کی راہ لی۔ ظفرنگر پہنچا تو یہ معلوم کر کے کہ فتح خاں نے بیجاپور پیغام بھیجا ہے کہ آجکل خانخانان سپہ سالار کے پاس فوج بہت کم ہے آپ ہجوم کر کے آویں اور مجھے رہائی دلائیں۔ فتح خاں اور نظام الملک کو گرفتار کر کے ان کا مال و اسباب بحق سرکار ضبط کیا۔ بعض مورخ اس گرفتاری کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کوچ کا نقارہ بجتا رہتا اور خانخانان سپہ سالار سوار ہو کر انتظار میں کھڑا رہتا مگر فتح خاں

خواب سے بیدار نہ ہوتا یہ امر اسے ناگوار گزرا اور اُس نے
اُس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ بہرحال واقعات چاہے جو کچھ
ہوں یہ لوگ گرفتار ہوکر شاہی لشکر کے ہمراہ برہان پور آئے
اور یہاں سے دارالسلطنت روانہ کیے گئے۔

خانخاناں سپہ سالار نے اس مہم کے صلے میں پانچ لاکھ روپیہ
انعام پایا اور اس نے اپنے متصدیوں سے دریافت کرکے کہ اس
مہم میں بیس لاکھ روپیہ صرف ہوئے ہیں یہ پانچ لاکھ روپیہ بھی
داخل خزانہ سرکار کرکے بذریعہ عرضداشت عرض کیا کہ فدوی
نے تین سال سے پیش کش نہیں روانہ کیا تھا اب دولت آباد
پیش کرتا ہوں۔ اسی پیش کش کے ساتھ یہ بھی استدعا کی کہ کسی
شہزادے کے ساتھ تازہ فوج روانہ کرکے بیجا پور کی تسخیر کا حکم
دیا جائے۔ اس کی یہ استدعا منظور ہوئی اور شاہزادہ شجاع تازہ
فوج کے ساتھ وارد دکن ہوا تو اس نے خانزمان کے ساتھ اس تازہ
فوج کو روانہ کرکے قلعہ پرندہ کو محصور کرلیا۔ اس کی مدافعت
کی غرض سے عادل شاہی لشکر نظام الملکی لشکر کے ساتھ جس کا
سردار ساہو بھونسلہ تھا آیا اور یہ کبھی برگی گیری کرتے اور کبھی
مورچہ بندی کرکے لڑتے خانخاناں نے یہ حال سنا تو موقع پر جا پہنچا
اور دشمنوں کو پہاڑوں کی طرف بھگا دیا ایک دن یہ لکڑی اور
گھانس کا انبار کرا رہا تھا کہ دشمنوں کی فوج نظر آئی اُسے دیکھ کر
راجپوت اُس طرف بڑھے اس نے انہیں روکا اور کہا کہ جب تک کافی
فوج نہ آجائے آگے بڑھ کر مقابلہ مت کرو مگر راجپوتوں کو اپنی بہادری
پر ناز تھا وہ اپنی جہالت سے باز نہ آئے اور دشمنوں پر جا پڑے۔

غنیم نے موقع پاکر اِس مختصر لشکر کو گھیر لیا اور قریب تھا کہ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ ناگہاں خاندوراں مع اپنے لشکر کے آپہنچا اور دشمنوں کو ہزیمت دے کر خانخاناں سپہ سالار کو اِس مہلکہ عظیم سے بچایا ؛

خاندوراں کو خانخاناں سے بغض للّٰہی تھا۔ اُس نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا کہ میں نے خانخاناں کی جان بچائی۔ یہ اُس کی باتیں سُن سُن کر رنجیدہ ہوتا مگر کچھ جواب نہ دے سکتا۔ چند ہی دنوں بعد ایک ایسا موقع پیش آیا کہ خاندوراں۔ شجاعت خاں اور سید خانجہاں کے ساتھ کہیں دیکھنے گیا دشمنوں نے موقع پاکر پہاڑوں سے بان پھینکنا شروع کیے اتفاق سے یہ بان گھاس میں پہنچ کر آگ لگنے کا باعث ہوئے۔ گھاس میں آگ لگتے ہی سارا جنگل آگ سے بھر گیا اور کسی کو کسی طرف بھاگنے کا یارا نہ رہا۔ شاہی لشکر کے امرا اونچے مقاموں پر کھڑے ہوکر یہ تماشا حیرت سے دیکھتے اور کسی طرح کی امداد نہ کر سکتے۔ مشہور ہے کہ اس آگ سے تیس ہزار جانور اور دس ہزار آدمی جل کر راکھ ہو گئے۔ خدا خدا کرکے آگ بجھی تو دشمنوں نے ہجوم کرکے چاروں طرف سے گھیر لیا اِس نازک موقع پر خانخاناں نے اپنا بدلہ اتارنے کے واسطے بڑی ہمت سے کام لیا اور فوراً مع اپنی فوج کے موقع پر پہونچ کر خاندوراں کو مع اس کے ساتھیوں کے بچا کے خاندوراں کی طعن و تشنیع سے نجات پائی ؛

بعض مؤرخ اِس ہنگامہ کا الزام خانخاناں کے سر تھوپتے ہیں مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بہرحال یہ محاصرہ تقریباً سات مہینے قائم رہا باوجودیکہ کئی دکنی سردار اور سیدی مرجان و غالب نامی قلعہ دار اِتنا

ایک دوسرے کے بعد مارے گئے مگر فتح کی صورت نہ نظر آئی اس ناکامی کی زیادہ تر وجہ شاہی لشکر کے سرداروں کی نااتفاقی تھی۔ خانخاناں جو تدبیر کرتا مخالف سردار اسے خفیہ ہی خفیہ دشمن تک پہنچا دیتے اور دکنیوں کو کچا چٹھا معلوم ہو جانے کی وجہ سے نقصان نہ اٹھانا پڑتا۔ کئی مرتبہ قلعے کے نیچے سرنگیں پہنچا کر باروت بھری گئی مگر دشمن نے اس کی خبر پاکر باروت نکال لی۔ یہ حال دیکھکر شہزادے نے بڑے بڑے سرداروں کو طلب کرکے صورت حال بیان کی تو انھوں نے واپسی کا مشورہ دیا خانخاناں نے ان سرداروں کی مخالفت کی مگر چونکہ خود شاہزادہ ان لوگوں کے نفاق سے گھبرا گیا تھا لہذا واپسی کا طبل بجوا دیا۔ اس موقع پر اکثر لشکریوں نے باربرداری کے جانوروں کی کمی دیکھکر بنجاروں کے جانور زیادہ قیمتیں دے کر خرید لئے۔

جب شاہی لشکر روانہ ہوا تو بنجاروں نے خانخاناں کا راستہ روک کر عرض کیا کہ "ہم حضور کے قول و قرار پر اعتبار کرکے یہاں اپنی جنس لائے تھے اب باربرداری کے جانور باقی نہیں رہے اپنی جنس کس طرح واپس لائیں" خانخاناں نے ان کے اس عجیب سوال پر کچھ دیر غور کرکے پوچھا "تمھارے کل مال کی کیا قیمت ہوگی" انھوں نے جواب دیا "دو لاکھ روپیہ" یہ جواب سن کر اس نے اپنے خزانچی کو طلب کیا اور حکم دیا کہ انھیں دو لاکھ روپیہ فوراً ادا کر دو۔ پھر بنجاروں سے مخاطب ہوکر کہا یہ روپیہ وصول کرنے کے بعد تم جس قدر مال اپنے ساتھ لے جا سکو لے جاؤ اور جو باقی رہ جائے اس میں آگ لگا دو۔

شاہ جہاں کو اس بے نیل و مرام واپسی کی خبر پہنچی تو اس نے

خانخاناں کو عتاب [illegible] لکھکر شہزادے کی [illegible]

خانخاناں شاہزادہ کا ساتھ چھوڑ کر برہان پور واپس آیا اور چونکہ کبھی کسی جنگ میں راجپوتوں سے ان کی جہالت اور حکم عدولی پر بد اعتقاد ہو گیا تھا لہذا اپنے دیوان کاکا پنڈت کو دس ہزار شیخ سید مغل پٹھان سوار بھرتی کرنے کو اس غرض سے اکبر آباد روانہ کیا کہ آئندہ سال بغیر کسی کمک کے قلعہ پرینده پر میں خود ہی فتح حاصل کروں۔ ابھی یہ نئی بھرتی کی ہوئی فوج آئی نہ تھی کہ اس کے پرانے مرض بھگندر نے جو ایک مدت سے عارض تھا شدت پکڑی اسی درمیان میں خانخاناں اس کی بدسلوکیوں سے ناراض ہو کر اعلیٰحضرت کے پاس چلا گیا۔ اس غم میں اور نیز قلعہ پرینده سے اپنی ناکام واپسی پر اور اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے آئندہ اُسے فتح نہ کرنے کے خیال میں مبتلا ہو کر اسے دق ہو گئی۔ حکیموں نے اس مرض کا علاج سخت پرہیز تجویز کیا اُس کا یہ علاج سن کر کہنے لگا میں پیشتر ہی علم نجوم کے ذریعے سے واقف ہو چکا ہوں کہ اس مرض سے جانبر نہ ہوں گا لہذا پرہیز سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اسی حالت میں اسے پھر قلعہ پرینده کے فتح کرنے کا خیال آیا اور دربار کر کے لوگوں کو اس کی تسخیر پر آمادہ کر کے کہا کہ میں اپنی بیماری کی وجہ سے کار شاہی میں تساہلی نہیں کرنا چاہتا لہذا کل سب لوگوں کا قیام موہن نالہ پر ہونا چاہیے۔ موہن نالہ کے قیام میں مرض نے زیادہ شدت پکڑی تو اس نے چار ہزار اشرفیاں بطور خیرات تقسیم کرا کے اپنی بیوی خانم سے کہا کہ ہندوستان کی کنگھی کنگھی میری دشمن ہے لہذا ایک روپیہ کا مال بھی اپنے واسطے پوشیدہ نہ رکھو اور کل اثاثہ

جب یہ فہرست طیار ہو گئی تو حضور میں ملفوف کرکے بھجوا کر راجپوتوں کے سرداروں کو طلب کیا اور اُن سے کہا کہ تم لوگوں کی مدد سے میں نے بڑا نام پیدا کیا اور چونکہ اب میرا زمانہ آخر ہو رہا ہے لہذا اس خیال سے کہ کوئی شخص بعد میرے تم سے مواخذہ نہ کرے اور تمھاری موجودگی میں بادشاہی متصدی میرا مال و اسباب ضبط کرکے میرے عملے کو تکلیف نہ پہنچائیں میں نے اپنے کل اثاثہ کی فہرست حضور میں روانہ کردی ہے تم لوگوں سے استدعا ہے کہ میرے انتقال کے بعد میری لاش دہلی لے جاکر شاہ مردان کے حلقوں کے پاس دفن کرنا اور میرا کل اثاثہ بلاکم و کاست سرکار میں پہنچا دینا۔ پھر اسی قسم کی دوسری باتیں کرکے راہی ملک بقا ہوا ماہ زمانہ آرام گرفت) و (سپہ سالار رفتہ) تاریخ وفات ہوئی۔

۱۰۳۴ ۱۰۴۵

اس کی لاش بموجب وصیت راجپوت برہان پور سے دہلی تک اس کی حیات کی دستور کے موافق آداب و مجرا سلام کرتے ہوئے لائے اور سپرد زمین کرنے کے بعد اپنی اپنی جگہوں پر واپس گئے اس کا کل اثاثہ اعلیٰ حضرت نے سوا ہاتھیوں کے اس کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ نقد روپیہ کچھ باقی نہ تھا اس کی آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ سالانہ تھی مگر اس نے کبھی کچھ پس انداز نہیں کیا۔ اس کی ہمت اور اولوالعزمی مشہور تھی کسی کے آگے سر جھکانا عیب سمجھتا تھا ایک دن اپنے ندیموں سے کہنے لگا "خانخاناں تو تھی ہیں بخشش کا مادہ نہ تھا کسی نے جواب دیا اُسی وجہ سے تو اس کا فروغ دربار شاہی میں نہیں ہوا" کہنے لگا یہ بات لغو ہے اصل یہ ہے کہ انسان کی مردمی یہی ہے کہ جانفشانی کرکے رتبہ پیدا کرے اور

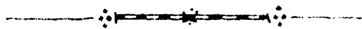
دل کھول کر صرف کر ڈالے۔ اس نے لالچ میں پڑ کر ایسا نہیں کیا" اس نے اپنی تمام عمر میں کبھی پانچ روپیہ سے زیادہ کی پوشاک نہیں پہنی خوراک بھی زیادہ نہ تھی اور سادی غذا پسند کرتا۔ اسے ہاتھیوں کا شوق تھا جہاں اچھا ہاتھی مل جاتا خرید لیتا ان کی غذا کا بھی خاص اہتمام کرتا ان کے راتب میں برنج گھی شکر اور ولایتی خربوزے معمولاً ہوتے۔ مزاج میں تکلف بالکل نہ تھا اپنی سواری کے وقت نوبت نہ بجواتا کوچ کے وقت حسب دستور نقارہ و قرنا بجتے۔ علم سے زیادہ بہرہ نہ تھا۔ جوتش و نجوم میں اچھی مہارت تھی۔ حافظہ ایسا قوی تھا کہ معمولی معمولی باتیں بہت دنوں تک یاد رکھتا۔ اکثر امرا اور اکابرین کے نسب نامے زبانی یاد تھے۔ ایرانیوں سے بہت میل جول رکھتا اور اسی وجہ سے مصنف ماثر الامرا کا خیال ہے کہ وہ آخر عمر میں شیعہ ہو گیا تھا اور اس کے شیعہ ہونے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ جب مرا ہے تو نادعلی اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر نادعلی سنی و شیعہ سب ہی پہنتے ہیں۔ لہذا یہ دلیل قابل توجہ نہیں۔ حقیقت میں اس کی طبیعت سپاہی منش تھی مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ روزہ رکھتا تھا نہ نماز کا پابند تھا سزا دینے میں بے باک تھا۔ لہذا اس کی سفاکی بھی مشہور عام تھی۔ اپنی کسی قیمتی سے قیمتی چیز کی پروا نہ کرتا۔ مگر شاہی مال کا ایک تنکا بھی ضائع ہونا برا سمجھتا جس شخص کے ساتھ ایک مرتبہ بھی احسان کرتا پھر وہ چاہے جیسی خطا کرتا اسے نقصان نہ پہونچاتا اس کی مجلسوں میں اکثر شعر و شاعری کا چرچا رہتا کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا مگر اس کا اظہار کم وہ سمجھتا اس کا

یہ شعر مشہور ہے ؎

ننگ دلم بود کہ بہشت آرزو کند
دوزخ نصیب من بود و آرزو مباد

اپنے بعد چند بیٹے اور کئی بیٹیاں چھوڑیں - ان میں سے امان اللہ خاں خانزماں اور لہراسپ مخاطب بہ مہابت خاں تو آفتاب بن کر آسمان پر چمکے اور اپنے باپ دادا کا نام روشن کیا لیکن مرزا امیر ہمت جو ظالم ہونے کے ساتھ کاہل بھی تھا اور مرزا گرشاسپ خویش اللہ وردی خاں و مرزا بہزاد اور مرزا افراسیاب میں سے کسی نے ترقی نہیں کی اور خاموشی کے ساتھ دنیاوی منزل سے گذر گئے -

مہابت خاں نے آگرہ میں جمنا کے کنارے ایک عالیشان محل بھی تعمیر کرایا تھا مگر وہ اس کے مرنے کے چند ہی دنوں بعد ویران ہو گیا اس کے شکستہ درودیوار اور مٹی کا ڈھیر اب تک اس کے نام کی یاد دلا رہے ہیں -



من آنم کہ من دانم

یعنی

مولانا شرر مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری

"آپ بیتی"

(کلکتہ پہنچنا)

اب میں کلکتہ میٹیا برج پہونچا تو گویا ایک عالم سے نکل کے دوسرے عالم میں چلا گیا اور میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

۱۲۸۶ھ م ۱۸۶۹ء میں جبکہ ۹ سال کی عمر تھی میں کلکتہ گیا۔

برج میں میرے نانا منشی قمر الدین اور میرے والد منشی تفضل حسین جداگانہ مقامات پر رہتے تھے۔ نانا کا تعلق بخشی گری کے دفتر سے تھا لہذا بخشی گری کے ایک ملازم ذوالفقار علی خاں کے مکان پر رہتے تھے۔ ذوالفقار علی خاں ایک سن رسیدہ خوش عقیدہ اور دیندار بزرگ تھے۔ تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی۔ اور اگرچہ جاہل تھے مگر اکثر علما و اتقیا ان کے گھر میں آکے ٹھہرا کرتے۔ یہ مکان ایک تالاب کے بالکل کنارے واقع تھا ایسا کہ لوگ اسی کے کنارے بیٹھ کر وضو کر لیا کرتے۔ پندرہ سولہ گز کے فاصلہ پر داروغہ غلام عباس داروغہ کبوترخانہ کا [illegible] تھا جو پانی کے اوپر پختہ تہ دری سڑک سے بنا لیا گیا تھا۔ اس میں ہمیشہ افیونی، چاندو باز [illegible] کا ان کے گرد جمگھٹ رہتا۔ داستان گوئی اور بٹیر بازی کی صحبتیں ہوتیں۔ بیچ ہی میں بیٹھیے تو یہ بڑا دلچسپ تماشا تھا۔ والد منشی السلطان مرزا رمضان علی بیگ کے مکان پر مقیم تھے۔ اس لئے

کہ انکا تعلق منشی السلطان بہادر کے دفتر میں تھا اور خوش نویس ہونیکے باعث عرضداشتیں جو بادشاہ کے ملاحظہ میں جاتیں انھیں کے ہاتھ کی ہوتیں۔

منشی السلطان دربار شاہی کے بہت بڑے عہدہ دار تھے تمام اہل قلم سارا جانورخانہ، گاؤخانہ ورسالہ خسروی اور کوٹھی بہیت منزل اور ان کے تمام ملازمین ان ہی کے سپرد تھے جنکی برطرفی و بحالی ان کے اختیار میں تھی اور جانوروں کی دانہ خوری کی بابت آٹھ نو ہزار روپیہ مہینہ انھیں کے زیر اہتمام صرف ہوتا عرضداشت نویسی کے علاوہ منشی السلطان بہادر کے بیٹوں سردار مرزا و محمد مرزا کی تعلیم بھی والد کے ذمہ تھی۔ اس بنا پر وہ انکے مکان پر رہتے اور انھیں کے وہاں کھانا کھاتے میں لکھنؤ سے کلکتہ حاجی خدا بخش نام ایک بوڑھے بزرگ کے ساتھ گیا تھا جن کے بیٹے محمد علی خوشنویسی میں والد مرحوم کے شاگرد تھے اور بعد کے زمانہ میں دربار شاہی کا ہو نیکے عطارد الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور سب سے بڑے عہدہ دار شاہی بن گئے حاجی خدا بخش صاحب نے مٹیا برج میں پہونچتے ہی مجھے میرے نانا منشی قمر الدین صاحب کے پاس پہونچا دیا۔ اور پہلی رات میں انھیں کے ساتھ ذوالفقار علی خاں کے مکان پر تالاب کے کنارے سویا صبح ہوتے ہی والد مرحوم آکر مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور میں ان کے ساتھ منشی السلطان بہادر کے مکان پر رہنے لگا۔

وہاں والد کے شاگرد سردار مرزا اور محمد مرزا مجھ سے نہایت ہی محبت سے پیش آئے۔ اپنے گھر کے اندر لے گئے۔ اپنی والدہ اور بہنوں سے ملایا۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کی والدہ اعلیٰ طبقے کی امیر بیگموں کی طرح بڑی شان و شوکت سے رہتی تھیں پہلی مرتبہ جو وہ مجھے ان کے سامنے لے گئے تو میرے ہاتھ پر ایک تہ کیا ہوا اسفید دستی رومال اور اُسپر ایک روپیہ رکھ کے کہا کہ یہ انھیں نذر دکھاؤ میں ابھی تک جانتا نہ تھا کہ نذر کیا چیز ہے، وہ روپیہ میں نے انکے سامنے پیش تو کیا مگر جیسے ہی اُنھوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا میں مٹھی بند کرکے بھاگ آیا اور بڑی ہنسی ہوئی

"Registered No: B. 3126

رجسٹرڈ [illegible] سرکارِ عالی نمبر ۱۲۴

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم و مغفور

کی یادگار

رسالہ



نمبر ۵ بابت ماہ مئی ۱۹۳۳ء جلد ۳۲

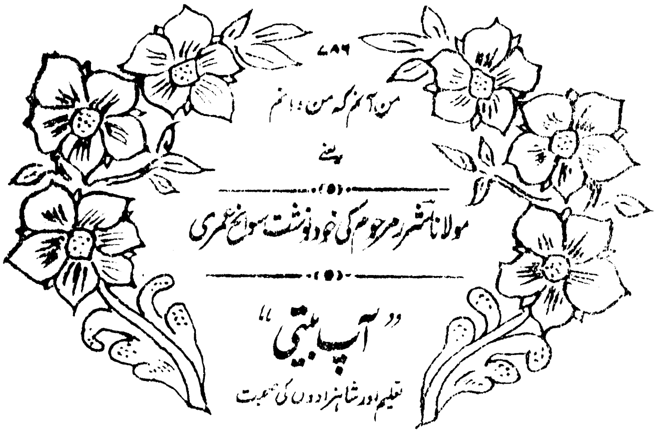
مرتبہ

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

مطبع دلگداز اورنگ آباد دکن میں چھپا

اور باہتمام ایڈیٹر مذکور شائع ہوا

سالانہ چندہ (عہ) سکہ انگریزی



۷۸۶

من آنم کہ من دانم

یعنی

مولانا شررؔ مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری

"آپ بیتی"

تعلیم اور شاہزادوں کی صحبت

اب میری عمر پندرہ سال کو پہونچ گئی اور مولوی علی حیدر صاحب کی شاگردی کی برکت سے شاہزادہ مرزا اجلال سے ملاقات ہوئی تو روز اُن کے وہاں جانے اور گھنٹوں اُن کی صحبت میں بیٹھنے لگا - مرزا اجلال بہادر سے ملنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ کئی شاہزادوں سے ربط وضبط بڑھا - محمد علی میرزا ، مسعود قدر میرزا ، فرخ میرزا ، اور میرزا کام بخش سے اس درجہ تعلقات ہوگئے کہ تعلیم کے سوا اب میرا سارا وقت اُنھیں کی صحبت میں گزرتا - اور مجھ سے بڑا کوئی اُن کا رفیق صحبت نہ تھا - پہلے محمد علی میرزا سے ایسا راہ و رسم ہوا کہ بغیر میرے اُنھیں اور بغیر اُن کے مجھے ایک گھڑی بسر کرنا دشوار ہوتا - اور اس کے بعد مجھ میں اور میرزا کام بخش میں نہایت ہی گہری اور خلوص کی دوستی ہوگئی - انجام یہ ہوا کہ اُن کی صحبت چھوڑ کے کسی طرح لکھنؤ آنے کو جی نہ چاہتا -

اس صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ میں بدکاری اور رندانہ مشربی کے اخلاق و عادات ترقی کرتے کرتے میرے رگ وپے میں سرایت کر گئے - مگر اس سے فائدہ بھی یہ ہوا کہ محلات کی عورتوں اور بعض بادشاہ کی بیگموں کے پاس بیٹھنے اُٹھنے اور باتیں کرنے سے مجھے تہذیب وشائستگی اور آداب نشست و برخاست کا سبق ملا - اور میری زبان خاص شاہی محل کی زبان ہوگئی -

والد کے دوستوں اور شاہی ملازموں میں ایک کلکتے کے بزرگ مولوی دین محمد خاں صاحب

تھے جو میرے حال پر پدرانہ شفقت فرماتے ۔ اُن کی انگریزی دانی ضرب المثل ہو رہی تھی
چاہتے تھے کہ میں خاص کلکتے میں اُن کے گھر پر رہ کے مدرسہ عالیہ میں انگریزی پڑھوں
مگر عربی و فارسی کی تعلیم کا مجھ میں اسیا قدر ذوق و شوق بڑھا دیا گیا تھا کہ انگریزی سے ایک قسم کا
تعصب پیدا ہوگیا تھا ۔ والد کے منظور کر لینے پر بھی مجھے نہ عربی درسیات کے سبق چھوڑنا
گوارا ہوا اور نہ شاہزادوں کی صحبت چھوڑی گئی ۔ جب کبھی لکھنؤ آتا تو یہاں البتہ محلے
کے ایک مشنری مدرسے میں نام لکھوا دیا جاتا ۔ مگر وہ برائے نام ہی ہوتا ۔ اس لئے کہ
میں نے کبھی انگریزی کا سبق نہیں یاد کیا ۔

اس زمانے میں میں نے طب یونانی کی کتابیں بھی پڑھنا شروع کر دیں ۔ میزان الطب
اور مفرح القلوب ' رسالہ ہائے نبض و قارورہ والد سے پڑھے ۔ پھر حکیم محمد مسیح صاحب
مرحوم کی شاگردی اختیار کر کے قانونچہ ' موجز ' سدیدی ' اقصرائی اور مفرح القلوب
اُن سے پڑھیں ۔ اور اُن کے مطب میں بیٹھ کر نسخہ نویسی کرتا رہا ۔

حکیم محمد مسیح صاحب کا برتاؤ اُستادوں اور بزرگوں کا سا نہ تھا بلکہ برابر والے
دوستوں کی طرح ملتے ۔ اُن کے زیادہ شاگرد نہ تھے ۔ میں ملا کے فقط تین آدمی اُن کے
شاگرد تھے ۔ اور سب میں چھوٹا میں تھا ۔ وہ ہر جمعہ کو ہم تینوں شاگردوں کو نواب
خاص محل صاحبہ کی کوٹھی میں اپنے یہاں بلا یا کرتے ۔ نہایت عمدہ اور نفیس پر تکلف
کھانے کھلاتے اور دن بھر شطرنج اور ہنسی مذاق میں گزرتا ۔

اب میری اخلاقی حالت عجب کشمکش میں پڑی ہوئی تھی ۔ حکیم محمد مسیح صاحب
کی صحبت تہذیب سکھاتی اور رخروانہ حجیب کو دور کر کے بڑوں میں گفتگو کرنے اور
اُن سے ہم صحبت ہونے کا سلیقہ بتاتی ۔ قبلہ و کعبہ کی صحبت اور اُن کے شاگردوں اور
معتقدوں سے ملنا جلنا ثقاہت و اتقا کا سبق دیتا ۔ اور شاہزادوں کی صحبت انتہا درجے
کا رند مشرب بلکہ لامذہب بنا رہی تھی ۔

لیکن منشی السلطان بہادر کا گھر میری زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہا
تھا ۔ اُن کے یہاں اکثر علما و فضلا اور اتقیا و اولیا کا مجمع رہتا ۔ خود بڑے دین دار
اور پابند صوم صلوٰۃ تھے ۔ اُن کے دروازہ پر ایک مسجد تھی جو "یٰسین خاں کی مسجد"
کہلاتی ۔ اس کی خدمت اُنھوں نے اپنے ذمے لے لی تھی ۔ اس میں انھیں کی طرف

سے امام اور موذن مقرر تھے - مسجد میں جو کوئی آکے ٹھیر جاتا اُس کے لئے کھانا اُنھیں کے یہاں سے جاتا - اور اُس میں ایک دینی کانگریس گے شن قائم تھا - جس میں ہمیشہ دینداری کی باتوں کا چرچا رہتا - اکثر ختم پڑھے جاتے - فرنگی محل لکھنؤ سے مولوی فخر الدین صاحب بلا لیے گئے تھے جو میرے ساتھ رہتے اور ہر جمعے کو بعد نماز مسجد میں وعظ کہتے - جس میں میں اُن کے سامنے بیٹھ کے قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھتا اور وہ اُسی کے متعلق وعظ فرماتے -

عراق کے سنی علما و زہاد مہینوں مسجد میں مہمان رہتے اور ایک بڑے متبحر ایرانی عالم اور شیراز کے مجتہد زادے ملا ہدایت اللہ شیرازی برسوں اُن کے گھر پر رہے اور میرا رہنا سہنا اور سونا جاگنا تک اُن کی نظر کے سامنے تھا -

ان بزرگوں کے علاوہ غلام محی الدین خاں تاجر عنادل اُن کے دو بھائیوں غلام یعقوب خاں و غلام مصطفیٰ خاں اور اُن کے لائق ملازموں کا بھی ہمیشہ مجمع رہتا - اور میرا گھر کا سارا وقت اُنھیں لوگوں میں بسر ہوتا یہ سب لوگ ہمیشہ فارسی میں گفتگو کرتے اور مجھے بھی بجز اپنے والد اور ہندی دوستوں تک سے فارسی میں بات چیت کرنا پڑتی - غلام محی الدین خاں کی میرے حال پر خاص عنایت تھی - وہ اکثر مجھے کلکتے لے جاتے اور جمعہ خاں کے کٹرے میں ہفتوں مقیم رہتے جہاں بجز کابلیوں اور فارسی بولنے والوں کے کوئی اور شخص نہ آتا - اُن کا ایک ملازم بابا خان بدخشانی میرا ایسا دوست ہو گیا کہ قبلہ و کعبہ اور شاہزادوں کے وہاں تک میرے ساتھ جانے لگا -

میرزا ہدایت اللہ شیرازی نے کمال شفقت سے مجھے صدرا پڑھانا شروع کر دیا - چونکہ وہ اُردو نہ جانتے تھے اس لیے میں فارسی میں معنے کہتا اور وہ فارسی میں ایسی زبردست سلجھی ہوئی اور زور دار تقریر کرتے کہ آج تک میں نے کسی اُستاد کو ایسی خوبی سے تقریر کرتے نہیں دیکھا - میرزا ہدایت اللہ کلکتے کے ایرانیوں میں مقتداؤں کی سی حیثیت رکھتے تھے - اکثر کلکتے جاتے اور مجھے ساتھ لے جاتے جہاں وہ دو تین تین دن تک میں قابل اور شریف عجمیوں میرزا محمد حسین ناخدا اور میرزا معصوم وغیرہ کی صحبت سے فیض اُٹھاتا -

اسی اثنا میں ایک رومی نژاد معمر و پاک باطن بزرگ سید جمال الدین رومی

آکر منشی السلطان کے گھر پر ٹھیرے - اُن کی زبان بھی فارسی تھی - منشی السلطان بہادر ضیاء اللہ شاہ نام ایک پنجابی بزرگ کے مرید تھے جو ہر دوسرے تیسرے برس آتے اور چند روز رہ کے چلے جاتے - اس زمانے میں اُن کا انتقال ہوگیا تھا - سید جمال الدین کو آئے دو ہی چار دن ہوئے تھے کہ منشی السلطان نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ فرما رہے ہیں سید جمال الدین رومی کے مرید ہو جاؤ - چنانچہ صبح کو اُٹھتے ہی اُنھوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کرلی -

سید جمال الدین ذی علم اور تصوف میں وسیع النظر بزرگ تھے - مگر استعداد علم سے زیادہ طلاقت لسانی اور باتوں میں شوکت الفاظ سے کام لیتے تھے - ایرانی عموماً زبان آور ہوتے ہیں - مگر سید جمال الدین کے سامنے وہ زبان نہ کھول سکتے - اپنے آپ کو رومی بتاتے تھے - اور مشائخ روم کی وضع میں رہتے - مگر ایرانی اُن کے لب و لہجے سے اندازہ کرکے بتاتے تھے کہ وہ ایرانی مازندرانی ہیں -

سید جمال الدین صاحب منشی السلطان کے یہاں آکے ٹھیرے تو اُن کی نظر محبت میرے حال پر بھی ہوئی - مجھ پر بے حد شفقت فرمانے لگے اور مجھے اپنے سامنے سے نہ اٹھنے دیتے - اور آخر خود ہی فرمایا کہ میں تمھیں مثنوی مولانائے روم پڑھانا چاہتا ہوں - اُن کے ارشاد فرماتے ہی والد کا تقاضا ہوا - منشی السلطان بہادر نے بھی تاکید کی - اور میں مثنوی پڑھنے لگا - مگر یہ سبق کیا تھا معرکہ آرا لکچر تھے - اکیلا میں پڑھنے والا تھا اور بیسیوں سن رسیدہ آدمی مریدوں اور ایمان لانے والوں کی شان سے سامع[5] - اور شاید تمھیں کے خیال سے یا اس مقصد سے کہ ملا آیت اللہ شیرازی اور غلام محی الدین خان کابلی پر اپنا اثر ڈالیں سید جمال الدین صاحب مثنوی شریف کے اشعار کے مطالب شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کے علاوہ صدہا رموز باطن اور لطائف معرفت بتاتے اور ناظرین (؟) عش عش کرجاتے - یہ سبق شاید دو ہی تین مہینے رہا تھا کہ سید جمال الدین صاحب چلے گئے اور وہ صحبت برہم ہوگئی -

یہ بیان کردینا چاہئے کہ سید جمال الدین صاحب عام ایرانیوں کی طرح نہایت خوش خط تھے - اور اُن کے ہمراہ "مصطفےٰ" نام ایک عجمی نوجوان ملازم تھا - جو اپنے آپ کو

---

[5] سامعین - (ایڈیٹر)

ظاہر تو نہیں کرتا تھا مگر دراصل عجمی شیعہ تھا - اور اس کا لب و لہجہ اہل شیراز و اصفہان کا تھا - مصطفےٰ بھی بڑا خوش نویس تھا - اور دن بھر نہایت پاکیزہ خط میں کوئی تحریر لکھا کرتا اور اُسے بالکل راز رکھتا - اُس کی تحریروں کو جو کتابی اجزا کی صورت میں ہوتیں سید جمال الدین ہفتہ وار جمع اور مرتب کرکے کسی شخص کے پاس رنگون بھیج دیا کرتے - یہ اُن کا ایک راز سربستہ تھا جس کو کوئی حل نہ کر سکا - اور عجمیوں نے جو اسی گھر میں ہونے کے باعث اُن کے رقیب بنے ہوئے تھے مشہور کر دیا کہ سید جمال الدین گورنمنٹ روس کے جاسوس ہیں جو ہر روز کا حال اپنے کسی رنگونی دوست کے ذریعہ سے وہاں بھیجا کرتے ہیں -

---

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم

والد مرحوم کے احباب سے جو اکثر ان کی صحبت میں رہتے تھے میں نے یہ درخواست کی ہے کہ وہ مولانا شرر مرحوم کے متعلق کسی نوعیت کے جو واقعات یاد ہوں براہ کرم لکھ دیں تاکہ دلگداز میں شایع کر دیے جائیں - اور اس طرح مولانا مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری کے ساتھ اُن کی زندگی کے مختلف حالات کا ایک نایاب ذخیرہ جمع ہو جائے گا میرے کرم مولوی محمد مظفر حسین صاحب سلیمانی نے سب سے پہلے لکھ کے مجھے بھیج دیا جس کی بابت میں اُن کا بہت ممنون ہوں اور اس رسالے میں شایع کرتا ہوں -

مجھے اُمید ہے کہ مولانا مرحوم کے دیگر احباب بھی اسی طرح کچھ حالات لکھ کے مرحمت فرمائیں گے تاکہ میں اُن کو دلگداز میں شایع کر سکوں -

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

شرر نہیں مگر افسانہ شرر ہے مشہور
بشر کے نام کو زندہ کمال رکھتا ہے

آسمان کمال کے ستارے آنکھوں سے چھپتے جاتے ہیں اور بزم دنیا میں تاریکی بڑھتی جاتی ہے - یہ قول مولانا شرر کی ذات اور اُن کی ناگہانی وفات پر صادق آتا ہے مولانا شرر کی قابلیت، اُردو نگاری، خوش اخلاقی مشہور روزگار ہے - ناول نویسی

ہیں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے - وہ اس کے موجد اور لوگ مقلد ہیں - ہندوستان کا ان کو اگر شکسپیر کہا جائے تو زیبا ہے - مولانا لندن بھی گئے تھے - یورپ دیکھ آئے تھے - معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا - وہ ایشیائی مذاق اور انگریزی تہذیب دونوں صفات کے مجموعہ تھے - جناب **مرحوم** کی اُردو ایسی فصیح و دلچسپ ہوتی تھی کہ جس تصنیف کو اُٹھا کر دیکھو جب تک وہ ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا - شہرت اگرچہ ناول سے ہوئی مگر درحقیقت آپ مورخ اور عالم بھی تھے۔ لڑکپن میں آپ کا قیام اپنے والد حکیم تفضل حسین صاحب اور نانا مولوی قمرالدین صاحب کے ساتھ جو دفترِ شاہی میں ملازم تھے مٹیا برج کلکتہ میں تھا اس لئے ابتدائی کتابیں وہاں لائق الدولہ، مولوی تائمۃ الدین، مولوی علی حیدر صاحب، مفتی محمد عباس صاحب سے پڑھیں - اس کے بعد لکھنؤ میں مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے فقہ تفسیر اور دیگر علوم عربی کی تحصیل فرمائی - جب ان کتب درسیہ سے فراغت حاصل کر چکے تو دہلی تشریف لے گئے اور مولوی نذیر حسین صاحب محدث سے علم حدیث کی تکمیل کی - جب علماے مشاہیر سے سند مل گئی تو تصنیف تالیف کی طرف توجہ کی پہلا مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اس کے بعد شاعری کی جانب مائل ہوئے شرر تخلص اختیار کیا اور جناب نظم سے اصلاح لی - مگر نثر سے طبعی مناسبت تھی اس فن میں وہ ترقی کی کہ تمام ہندوستان میں شہرت پھیل گئی - شاعری تو چھوٹ گئی مگر تخلص ساری دنیا میں مشہور ہو گیا اہل وطن بھی آپ کی قدر کرتے اور باہر کے لوگ مشتاق ہو کر ملنے کو آتے تھے - اکثر والیان ملک نے ان کو بڑی توقیر سے بلوایا اور بہت عزت سے پیش آئے -

چونکہ راقم الحروف سے دوستانہ تعلقات تھے اور اکثر صحبت گرم رہی ہے لہذا یہ خاکسار جو کچھ لکھے گا زیادہ تر ان کے چشم دید واقعات ہوں گے یا جو انھوں نے خود سنائے وہ حالات ہوں گے

اعلیٰ حضرت حضور نظام بھی جناب شرر کی اُردو پسند فرماتے تھے اور بعض تحریروں میں بندگان عالی نے اپنے قلم سے ان کو مخاطبت فرما کر سرفراز کیا ہے -

اکثر کی درخواست پر جب عہد عثمانی کی تاریخ نگاری منظور فرماتے ہوئے سلطان دکن نے فرمان صادر کیا ہے اس میں بھی مولانا شرر کے متعلق یہ بیش بہا رائے ظاہر فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فن تاریخ نگاری میں اُن کو اچھا عبور حاصل ہے اور اس کام کے لئے ان کا تقرر کیا جانا ہر طرح موزوں ہے - نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ

والیۂ بھوپال نے جب تاریخ اسلام لکھانے کا ارادہ فرمایا تو مولانا شرر کو طلب کیا تھا ایک روز بھوپال میں نواب احتشام الملک عالی جاہ سے ملنے مولانا تشریف لے گئے مگر بلانے میں کچھ دیر ہوئی - آپ ہمایوں منزل سے اُٹھ کر باہر چلے گئے تھوڑی دیر کے بعد چوبدار کارڈ لے کر آیا اور کہا کہ نواب سلطان دولہ بہادر شرر صاحب کو یاد فرماتے ہیں - لیکن مولانا جا چکے تھے - آپ کی عدم موجودگی پر افسوس کیا گیا - احقر بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا -

مہاراجہ بڑودہ نے جب فن موسیقی کے متعلق کانفرنس قائم کی تو بڑودے میں مولانا کو بلایا آپ نے اس موضوع پر اصول النغمات و حصرہ سے ایک دلچسپ لکچر مرتب کیا اور اُس میں عہد گذشتہ کے ماہرین فن کے حالات تحریر فرمائے - جب یہ لکچر بڑودے کے دربار میں پڑھ کر سنایا تو جا بجا کے اہل کمال وہاں موجود تھے وہ نہایت محظوظ ہوئے مہاراجہ بڑودہ آپ سے ملے اور بہت اعزاز کیا - فن موسیقی کے متعلق دیر تک مفصل طور پر علمی گفتگو کرتے رہے -

اسی طرح ریاست پالن پور میں آپ کو بلایا گیا ہز ہائینس پالن پور اور نواب میاں وزیر اسٹیٹ نے مولانا کی نہایت قدر و منزلت کی اور بہت فیاضانہ خاطر مدارات فرمائی - نواب میر بہادر حسین خاں انجم کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ جناب شرر کی شہرت اتنی پھیلی کہ جس طرف شہر میں نکلتے ہیں خاص و عام میں ان کی طرف انگلیاں اُٹھتی ہیں کہ دیکھو یہی شرر ہیں نواب صفی الدولہ حسام الملک علی حسن خاں بہادر نے کئی بار بہ سبیل تذکرہ راقم سے کہا کہ لکھنؤ کو مولانا شرر کی ذات پر ناز ہے -

علمائے فرنگی محل اطبائے جھوائی ٹولہ اور دیگر مشاہیر و معززین لکھنؤ مولانا کا احترام کرتے اور ان کے مکان پر تشریف بھی لاتے -

ایک بار محلہ جھوائی ٹولہ میں حکیم عبد العزیز صاحب کے مکان کے متصل بند کو دو جنٹلمین فیشن ایبل ملے اور انھوں نے کہا کہ ہم پنجاب سے لکھنؤ میں آئے اور مولوی عبد الغنی صاحب سشن جج کے مہمان ہیں مولوی عبد الحلیم صاحب شرر کی کتابیں دیکھی تھیں اور ان کا نام سُنا تھا ان کے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے وہ اس عہد کے اہل کمال سے ہیں ہم بھی اُن کو دیکھ لیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپ اُن کے مکان کا پتہ ہم کو بتا

ویں - چنانچہ وہ پتہ بتاتے ہوئے راستہ سے مکان پر پہونچے اور بڑے خلوص کے ساتھ مولانا سے ملے -

مولانا شرر کے شاگردوں میں بعض جلیل القدر اور نامور حضرات ہیں نواب ولی الدولہ بہادر بھی آپ کے شاگرد رشید ہیں سرو قار الامرا نواب اقبال الدولہ بہادر نے جو آپ کا پاس و اعتبار کرتے تھے جب اپنے فرزند ارجمند کو تعلیم کے لئے یورپ بھیجا ہے تو مولانا کو بطور اتالیق کے ان کے ساتھ کر دیا تھا -

راقم سے خود مولانا نے بیان کیا تھا کہ جس زمانے میں اعلیٰ حضرت حضور نظام نے اپنی سوانح عمری لکھانے کے لئے مجھے بلوایا ہے تو ایک روز کنگ کوٹھی میں ڈنر ہوا میں بھی شریک کیا گیا نواب ولی الدولہ بہادر صدر اعظم بھی شرکت کی غرض سے تشریف لائے جیسے ہی مجکو دیکھا سب کے روبرو بیساختہ فرمانے لگے کہ مولوی صاحب آج کل آپ لکھنؤ سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے نہیں ملے اور مجکو آپ کے آنے کا علم تک نہ ہوا الحاصل نواب صاحب ممدوح مولانا موصوف کا بہت احترام کرتے تھے -

اسی طرح سید محمد رضا صاحب جسٹس آپ کے لائق تلامذہ میں ہیں پہلے وہ ضلع ہردوئی میں جج تھے اور اب لکھنؤ میں چیف کورٹ جج ہیں اور چار ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے کہ میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مولانا شرر جیسے قابل بزرگ میرے استاد ہیں مگر اس امر کا مجھے افسوس ہے کہ جیسی اُن کی علمی قابلیت ہے اور دنیا کی جس ثروت و مقدرت کے وہ مستحق تھے اُن کو حاصل نہ ہوئی -

مولانا کی بعض تصانیف کتابیں مُلک میں بہت مقبول ہوئیں اور بڑی مفید سمجھی گئیں اُن پر بعض اہل الرائے اشخاص نے اچھے خیالات ظاہر کئے چنانچہ حکیم نور الدین صاحب نے جو نامور طبیب ہونے کے علاوہ زبردست فاضل اور انشا پرداز تھے مولانا کو خط میں یہ لکھا کہ آپ کی کتاب فلورا فلورنڈا نے مجھے بہت فائدہ پہونچایا - میرے یہاں بھی اسی منش کی آزاد خیال عورت آیا کرتی تھی مجکو جناب کی تصنیف دیکھنے سے اُس کے ضرر رساں اثر پہونچنے کا خیال پیدا ہوا اور میں نے اُس کو اپنے گھر میں آنے جانے اور مستورات سے ملنے جلنے کی ممانعت کر دی -

ایک روز نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل اُستاد شہریار دکن نے مجھ سے

فرمایا کہ ایک بار مولانا شرر اور میں اور مولوی شبلی صاحب ایک جگہ جمع ہو گئے سب کی یہ رائے قرار پائی کہ اس وقت حسن اتفاق سے وہ مجمع ہے کہ جس میں ہر ایک شخص اپنے فن کا یکتائے روزگار ہے مولانا شرر اردو نگاری میں مولوی شبلی تاریخ نویسی میں اور جلیل شاعری میں وحید العصر مانے جاتے ہیں۔

جس طرح مولانا شرر کے شاگرد آپ کی لیاقت کی تعریف کرتے تھے اسی طرح آپ کے اُستاد بھی آپ کی غیر معمولی ذہانت اور رسائی ادراک کے معترف تھے اس کے ثبوت میں ایک واقعہ تحریر کیا جاتا ہے۔ احقر نے لکھنؤ ہوتے ہوئے جب حیدرآباد آنے کا قصد کیا تو مولانا شرر نے فرمایا کہ جس روز مولانا علی حیدر صاحب المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر سے آپ ملیں تو رسالہ جمال اختر کے لئے مضمون کا میری طرف سے ضرور تقاضہ کریں کہ مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے حالات جو اپنی آنکھوں سے آپ نے دیکھے ہیں وہ قلمبند کرکے عنایت کریں میں رسالہ کی تکمیل کرکے جلد اشاعت کرنے والا ہوں۔ حیدرآباد پہونچکر مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی سے مجھے جس دن ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اس بارے میں اُن سے عرض کیا کہ جناب کے شاگرد شرر صاحب نے مضمون کے لئے اصرار کیا ہے وہ آپ کے بزرگانہ اخلاق و علم و فضل کے مداح ہیں اور جمال اختر میں انھوں نے آپ کے روبرو زانوے تہ کرنے کا نہایت ارادت سے اظہار کیا ہے۔ یہ سُن کر طباطبائی صاحب نے فرمایا کہ یہ اُن کی شرافت و سعادت ہے کہ وہ میری اُستادی کو مانتے اور توصیف کرتے ہیں ورنہ لکھنؤ میں فی نفسہ وہ خود اُردو کے مشعل ہو رہے ہیں اور دنیا اُن کو نگاہ وقعت سے دیکھتی ہے اس میں شک نہیں کہ فی زمانہ جناب طباطبائی صاحب فضیلت علمی وسیع النظری و تحقیق میں علمائے سلف کی یادگار ہیں عہد شاہی کے نامی گرامی اساتذہ کو دیکھے ہوئے شہزادگان دکن اور شاہزادگان اودھ کے اُستاد ہونے کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے۔

محمڈن کالج علی گڈھ کی جب پچاس سالہ جوبلی قرار پائی اور بہت شان و شوکت سے اس قومی جشن کے لئے کمپ آراستہ کیا گیا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اُس میں مشاعرہ اور ترقی اردو کا جلسہ قرار دیا گیا اور یہ ایسا موقع تھا کہ اس علمی دربار میں ہر چہار طرف

سے ہندوستان کے اہل علم نامور جمع ہونے والے تھے جلسہ ترقی اُردو کی صدارت کے لئے مولانا شرر کا انتخاب ہوا - اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک نے اُن کو اُردو زبان کا ماہر اور اُستاد تسلیم کر لیا تھا - مراقم اس جلسہ میں شریک ہوا تھا افسوس کہ جوبلی کے زمانہ میں مولانا سخت علیل ہو گئے تھے اور علیگڈھ تشریف نہ لا سکے بارہ دری قیصرباغ لکھنؤ میں جب انجمن ترقی اُردو کا جلسہ منعقد ہوا بہت سے ذی علم حضرات مثل نواب نصیرالدین خاں خیالؔ وغیرہ آکر شریک ہوئے مولانا شرر بھی انجمن کی طرف سے مدعو کئے گئے آپ نے اُردو زبان کی خوبیوں اور اُس کی وسعت و ترقی کے متعلق ایک نہایت مبسوط اور دلچسپ تقریر مرتب کی تھی اور اُس کو جلسہ میں پڑھ کر سنایا بھی تھا اور یہ آپ کی مطبوعہ تقریر حاضرین جلسہ کو تقسیم کی گئی تھی خوب مجمع تھا احقر کا چشم دید واقعہ ہے -

تجربہ سے ثابت ہوا کہ مولانا شرر فی نفسہ سیر چشم اور مہمان نواز بھی تھے اپنی حیثیت اور آمدنی سے حوصلہ زیادہ رکھتے تھے کبھی مرزا محمد عسکری صاحب سکریٹری مہاراجہ محمود آباد کو پارٹی دے رہے ہیں اور کسی دن مرزا محمد ہادی صاحب رسوا کی پُرتکلف دعوت کر رہے ہیں مولانا کو آم کا بہت شوق تھا اور اُس کے ممبر بھی تھے جب آم کی فصل آتی تو چندا نامی میوہ فروش آم لایا کرتا اور مولانا اُس سے خریدتے جب آخر میں حساب ہوتا تو چار چار سو روپیہ اُن کے نکلتے اور یہ قیمت اُس کو ادا کرتے

راقم الحروف کو آپ کے ذاتی اخلاق و اوصاف ہونے کا اس وجہ سے علم ہوا کہ میں جب کبھی اپنے وطن شاہ آباد سے لکھنؤ آتا تو قیصرباغ میں ٹھہرتا لیکن تقدیری امر کہ چودھری نصرت علی صاحب سکریٹری انجمن ہند تعلقہ داران اودھ اور خان بہادر منشی سید التفات رسول صاحب تعلقہ دار و رئیس اعظم سندیلہ - دونوں معزز میزبانوں کا انتقال ہو گیا - تو ہوٹل میں قیام کرنا شروع کیا جب مولانا شرر کو اس بات کی آگاہی ہوئی تو بہت شکایت کی اور قیام گاہ سے سامان اُٹھا منگایا - اور عہد لیا کہ آیندہ مسافر خانہ میں نہیں ٹھہروں گا چنانچہ اس کے بعد جب کبھی لکھنؤ آنا ہوتا تو مولانا ہی کے مکان پر قیام کرتا اور وہ اخلاق کریمانہ سے ایسی خاطر مدارات کرتے کہ لکھنے سے قاصر ہوں -

دوران قیام میں اکثر اوقات مولانا علمی تذکرے کرتے کسی وقت مشاہیر اسلام کے اوصاف بیان کرتے۔ بعض وقت شاہ اودھ کے چشم دید حالات سناتے۔ مشرقی تمدن اور اصول فطرت سے بحث کرتے۔ آپ کا حافظہ قوی تھا اور خیالات فلسفیانہ تھے گفتگو اکثر استدلالی ہوتی۔

آپ نے رات دن کے اوقات تقسیم کر دئے تھے ۸ بجے سے دوپہر تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے سہ پہر کو آرام کرتے شام سے دس بجے تک حکیم عبدالحمید صاحب جو خوش اخلاق حذاقت شعار طبیب ہیں اور خان بہادر احمد حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ جو دولتمند تاجر ہیں اُن کے مکان پر جاکر بیٹھتے اور یہ کہا کرتے کہ دن میں لکھتے لکھتے طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے ان ملاقاتوں سے شہر کی تازہ خبریں معلوم ہوتی ہیں اور احباب کی پر لطف باتوں سے دماغ کو تازگی اور دل کو تفریح حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مخلص کو بھی بارہا ساتھ لے گئے اور اگر ناواقف حضرات ملے تو عزت افزا الفاظ سے راقم کا تعارف کرایا اور مخدوم کا لفظ استعمال فرمایا۔ اگر کوئی نیا ناول لکھتے ہوتے تو وہ بھی دیکھنے کے واسطے مجکو عنایت کرتے۔ چنانچہ ملا صفرہ اور مینا بازار وغیرہ کے مسودے طبع ہونے کے قبل احقر کو دکھلائے تھے اُن کی تحریر میں اس بلا کی دلکشی ہوتی تھی کہ جب تک پورا ناول نہ دیکھ لیتا واپس نہیں کرتا تھا

شکنتلا کا قصہ کالیداس نے جو راجہ بکرماجیت کے دربار کا مشہور شاعر ہے ہندی میں لکھا ہے اُس کا ترجمہ بھی اردو میں مولانا نے ناول کے پیرایہ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اُس کے چند باب خود ہی اُنھوں نے مجکو سنائے تھے اور کالیداس کی شاعری و کمال کی وہ تعریف کرتے تھے۔ صد حیف کہ یہ اُن کا آخری ناول تھا اس کو وہ ختم نہیں کرنے پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہنے پر تیار ہو گئے۔ مولنا شرر سے برسوں اس خاکسار کے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ وضعداری کا رنگ اُن میں پختہ تھا۔ خط و کتابت کا سلسلہ مدتوں جاری رہا اس لئے اُن کے خطوط کا کافی ذخیرہ راقم کے پاس موجود ہے۔ ایک خط کی نقل یہاں پر اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ناظرین کو اُن کے خطوط کے طرز تحریر کا اندازہ

بھی ہو جائے اور اس صورت مین عبارت کی بقا بھی ہو جائے گی۔

نقل خط مولانا شرر بنام مضمون نگار

مولائے محترم و فاضل اجل دام مخدومی مکرمی مولانا محمد مظفر حسین صاحب سلیمانی زاد کرمہٗ

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ عدیم الفرصتی کے باعث گرامی نامہ کا جواب دیر میں عرض کر سکا معاف فرمائیے۔ آپ کی محبت و خلوص و عنایت میرے دل پر نقش ہے۔ آپ کے کمالات اور آپکی خوبیاں بھولنے والی چیز نہیں میری نسبت جناب کے خیالات چشم عنایت کا نتیجہ ہیں۔ عین الرضا عن کل عیب کلیلۃ آپ ملک کے قابل مصنفوں میں ہیں میں کیا مشورہ دے سکوں گا۔ لیکن آپ کی یہی خوشی ہے کہ میں آپ کی جدید تصنیف گنجینۂ سلیمانی کے مضامین سے بہرہ یاب ہوں اور برائے نام آپ کی کوشش میں شریک ہو جاؤں تو بخوشی خاطر و بسر و چشم حاضر ہوں۔ آپ کے خط کو آئے دو ہفتہ سے زیادہ گذر گیا مگر کسی معذوری کے باعث آپ لکھنؤ میں تشریف نہ لاسکے مجھے شرف زیارت کا انتظار رہا اور ہے۔ باقی باتیں ملاقات کے وقت ہوں گی۔ آپ کے برادر عزیز کی وفات اور مقدمہ کے انکار کا حال سن کر تکلیف ہوئی خدا آپ کو مطمئن و شاد کام رکھے۔ مولوی ارتضا علی صاحب شرر میرے قدیم عنایت فرما تھے اور بڑے ذہین و طباع۔ خدا غریق رحمت کرے میری طرح بہتوں کا دل زخمی کر گئے

والسلام

خاکسار محمد عبد الحلیم شرر

۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۰ ہجری دفتر دلگداز ککڑ بزن بیگ نخاس لکھنؤ

مولانا شرر کی وفات

بظاہر تو آپ کے اچھے تھے کوئی ضعف و کمزوری کی علامت نہیں معلوم ہوتی

تھی وجع مفاصل کی شکایت ہونے سے بلاناغہ ہر روز صبح کے وقت ٹھنڈے پانی سے نہایا کرتے برسوں سے رات کا کھانا چھوڑ دیا تھا صرف دن کی غذا پر قناعت اختیار کی تھی - ۲۰ر دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء کو دن میں وہ تندرست تھے شام کو حسب معمول حکیم عبدالمعید صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے وہاں لرزہ محسوس ہوا رضائی اور لحاف اوڑھایا گیا مگر سردی کم نہ ہوئی - دس بجے استعانت سے اپنے مکان پر واپس آئے - حکیم صاحب نے سوء ہضم تجویز کرکے دوائیں دیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا بخار آ گیا سہ شنبہ چہارشنبہ کو تین دن تک علیل رہے - اطبائے جھوائی ٹولہ نے مثل عزیزوں کے مکان پر آکر علاج کیا مگر کوئی آثار صحت کے نہ ظاہر ہوئے فالج کا مرض تشخیص کیا گیا بالآخر کل نفس ذائقۃ الموت کا مصداق پورا ہوا شب پنجشنبہ تین بجے کے وقت روز جمعہ کو ۲۴ر دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء مطابق ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ ہجری چھ بجے سے پیشتر انتقال کیا ستر برس کی عمر ہوئی تمام لکھنؤ میں اُن کی اندوہناک وفات کی خبر مشہور ہو گئی اور ہر طرف افسوس کا اظہار کیا گیا یہ قدرتی اتفاقی امر ہے کہ مولانا ۱۷ر جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ ہجری روز جمعہ صبح کے وقت پیدا ہوئے تھے اور اُسی دن اور اُسی مہینہ و تاریخ میں انتقال بھی کیا انا للہ و انا الیہ راجعون راقم نے متعدد تاریخی مادے نکالے صرف بلحاظ اختصار ایک قطعہ تاریخ رحلت لکھا جاتا ہے ~

گئے دار فانی سے وہ شرر ~ جو قابل تھے فاضل تھے نامی شرر
خوش اخلاق عالم محقق ادیب ~ سخن سنج شیریں بیاں نثر نگار
ہوا اُن کی رحلت کا وہ سانحہ ~ کہ ہر دل پہ چھایا ہے غم کا اثر
ہوا بزم اُردو میں ماتم بپا ~ یہ پُر درد پر غم جو پہونچی خبر
ملے گا نہ اُردو کو ایسا ادیب ~ وہ فن میں تھے کامل وسیع النظر
زباں اُن کی کوثر سے دھوئی ہوئی ~ روانی میں الفاظ سلک گہر
وہ مضموں نگاری میں اُستاد تھے ~ وہ افسوں طرازی میں تھے نامور
چمن میں ادب کے خزاں آگئی ~ ہوا نثر کا نظم زیر و زبر
وہ میرے تھے مخدوم بیحد شفیق ~ جدائی سے میں کیوں نہ ہوں نوحہ گر

جو تھا لطف صحبت کا جاتا رہا ہوا تیر فرقت سے زخمی جگر
لکھے ناول ایسے نفیس و لطیف ہو مقبول دنیا ہوے بیشتر
اور اک لکھی تاریخ اسلام بھی ادا خدمت دیں بھی کی خوب تر
لکھی ایسی دلچسپ دنیائے حق کہ پڑھنے سے ہوتا ہے جس کا اثر
لکھی خوب ہے خاتم المرسلین شفاعت کریں گے شہ بحر و بر
خدا اپنی رحمت سے بخشے انھیں وہ ہوں قرب معبود سے بہرہ ور
مظفر جو ہے فکر تاریخ لکھو ہوئے جنتی کعبۂ دیں شرر

مختلف اخباروں نے آپ کی اچانک موت پر حسرت ناک مضامین لکھ کر شایع کئے اور رسالہ معارف میں مکرمی مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے جو صدمہ اہل علم کو آپ کی وفات سے پہونچا اس کو اچھے پیرایہ میں تحریر کیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ مولانا جیسے قابل کے اٹھ جانے سے جو اردو کو نقصان برداشت کرنا پڑا اس کی تلافی ناممکن ہے۔

بلدہ حیدرآباد میں بھی جن معزز لایق اشخاص سے مولانا کی رحلت کا ذکر آیا تو انھوں نے رنج و ملال کا اظہار کیا یمین السلطنت سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر صدر اعظم سے احقر نے جب مولانا کی وفات کے متعلق عرض کیا تو جناب ممدوح نے جو خود ذی لیاقت اور قدردان اہل علم ہیں اپنی زبان سے کلمات افسوس فرمائے - نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی سے جب خاکسار نے رحلت کی خبر بیان کی تو انھوں نے تاسف کیا اور یہ کہا کہ مشاہیر سے تھے - مولوی عبدالحق صاحب بی اے پروفیسر و سکریٹری انجمن ترقی اردو سے جب کبھی مولانا شرر کی خوبیوں کا تذکرہ آیا تو مولوی صاحب موصوف نے مولنا شرر کے اوصاف و قابلیت کا اعتراف کیا مولوی صاحب جدید تصنیف پر مقدمہ اور تقریظ خوب لکھتے ہیں کاش مولانائے شرر کی تصنیفات پر وہ تبصرہ تحریر کریں تو اک بڑا کام انجام کو پہونچ جائے -

یہ بڑے حسرت و افسوس کا مقام ہے کہ مولنا کی وفات کے بعد ان کا بھرا گھر خالی ہوگیا پہلے ان کا چھوٹا بچہ ریاض ہی تھا اس کے بعد ان کے دوسرے فرزند افتخار احمد نے دفعتہً ہیضہ میں انتقال کیا - بمصداق حدیث شریف موت الولد کیّ الکبد ان کی اہل خانہ کو اپنی اولاد کا ایسا قلبی صدمہ پہونچا کہ وہ بھی اس عالم فانی سے ملک جاودانی

گورنمنٹ گرگئیں ان بیوی کے نام ریاست حیدرآباد سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر تھا -

مولانا شرر کو اپنے لڑکے افتخار احمد سے بڑی محبت تھی ناز برداری سے اس کی پرورش کرتے تھے ذہین اور وجیہہ تھا ایف اے تک تعلیم بھی پا چکا تھا کئی بار مجھ سے کہا کہ اس کو آپ بھی اپنا بچہ تصور فرمائیں - یہ شرارت سے شیر ہو گیا ہے آپ عجائب خانہ لے جاکر زندہ و مردہ شیر اس کو دکھلا دیجئے اس نے تقاضہ سے میرا ناک میں دم کر دیا ہے - اسی طرح جب لارڈ ریڈنگ وائسرائے گورنر جنرل لکھنؤ آئے اور قیصر باغ میں منجانب تعلقہ داران اودھ ان کو دعوت دی گئی روشنی و آتشبازی کا انتظام بھی خوب کیا گیا - مولانا نے فرمایا کہ میں آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت ممنون ہوں گا کہ اگر آپ کسی رئیس دوست کے مکان واقع قیصر باغ سے افتخار کو روشنی و آتشبازی دکھلا دیں میں نے شب میں آنا جانا کم کر دیا ہے - چنانچہ قیصر باغ لے جاکر میں نے افتخار کو یہ شاندار منظر دکھلا دیا تھا - اب مولانا شرر کی اولاد نرینہ میں حضرت میاں صدیق حسن صاحب بڑے صاحبزادے باقی ہیں - خداوند کریم ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے - حق تعالے مولانائے مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں ان کی روح کو مسرور رکھے ؎

تصانیفِ شرر کے نقش ہیں ہر قلب پہ باقی
فنا کے بعد بھی ہیں دار فانی میں شرر باقی

ناچیز محمد مظفر حسین سلیمانی مصنف بہارستان مظفر - گنجینہ سلیمانی - چمنستان مظفر - تاریخ نامہ مظفری - حیات مسیح شرر حالات بانی فیہ
مقام حیدرآباد دکن
یکم ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

خان جہان

از جناب مولوی حکیم سراج الحق صاحب مینیجر دلگداز

اس کا اصلی نام پیر خاں تھا مگر شاہجہانی مورخوں نے محض ذلت و تحقیر کے واسطے اسے پیرا کے نام سے یاد کیا ہے۔ دولت خاں لودھی کی اولاد سے تھا۔ ابتدا میں یہ اپنے بھائی محمد خاں کے ساتھ بنگالہ میں راجہ مان سنگھ کے پاس رہا مگر محمد خاں کی وفات پر شاہزادہ دانیال کی مصاحبت میں داخل ہو کر اس سے ایسی دوستی بڑھائی کہ دونوں کا شمار ایک جان دو قالب میں ہونے لگا۔ اس شاہزادے کی وفات کے بعد قسمت نے اسے جہانگیر کی خدمت میں پہونچایا اور اس نے بھی اس کے عادات و اطوار پسند کر کے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ پھر سہ ہزاری منصب دے کر صلابت خاں کے معزز خطاب سے یاد کیا اس زمانے میں اس نے جہانگیر سے ایسے تعلقات بڑھائے کہ آپس میں دوئی نہ رہی اور امرا اکابر اسے حسد کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

جہانگیر نے مزید توجہ کر کے اسے خان جہان کا خطاب دیکر پنج ہزاری منصب ... معزز کیا اور غسلخانے (دربار خاص) میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ اس کا اعزاز یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ کچھ دنوں بعد اس میں اور ترقی ہوئی اور جہانگیر اپنے ساتھ محل کے اندر لیجانے لگا۔ غالباً اس حرکت سے اہل محل کو آزردہ دیکھ کر اس نے ایک دن ارادہ کیا کہ اس کی شادی کسی اپنے عزیز سے کردوں پھر اسے عملی جامہ پہنانے کے واسطے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تیری شادی کسی اپنے عزیز سے کر کے تجھے سلطان جہاں کا خطاب عطا کروں مگر اس نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ باتیں شہزادوں ہی کے واسطے زیبا ہیں غلام اس مرحمت سے معاف رکھا جائے تو بہتر ہے۔ اس کا یہ جواب سن کر جہانگیر اپنے ارادے سے باز رہا۔ مگر ہمیشہ اس سے دوستانہ سلوک کرتا رہا اور اس نے بھی کبھی جادۂ اطاعت سے اپنا قدم باہر نہ نکالا۔ ہمیشہ اپنے تئیں شاہی غلام ہی سمجھتا رہا۔

جس وقت دکن کے سفر کو تیار ہوا تو جہانگیر اسے رخصت کرنے کے واسطے

جھروکہ سے اُتر کر اس کے پاس آیا اور شاہی دستار اپنے سر سے اتار کر اس کے سر پر رکھی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر گھوڑے پر سوار کر کے نقارہ بجانے کا حکم دیا اور باچشم پُرنم اس کا گھوڑا آگے بڑھانے کی اجازت دی - شہنشاہ مغلیہ کی طرف سے یہ ایسی نوازشیں تھیں جو آج تک کسی بڑے سے بڑے امیر کے واسطے عمل میں نہیں آئی تھیں پھر انہیں امور پر ان نوازشوں کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ اس کے واسطے ہر منزل پر جہانگیر کی طرف سے تحفے و سوغاتیں پہونچتی رہیں - اور میدان جنگ سے برابر نامہ و پیام ہوتے رہتے - یہاں سے واپسی پر یہ پھر اپنی جگہ اپنے اُسی پورے اعزاز کے ساتھ اُس وقت تک مقرر رہا جب ایرانیوں نے قندھار لے لیا -

قندھار کا ہاتھ سے نکل جانا معمولی بات نہ تھی - لہٰذا جہانگیر نے اسے ملتان کا گورنر مقرر کر کے قندھار واپس لینے کی خدمت بھی اس کے سپرد کی - سرحد کے پٹھان اپنے ہمقوم شخص کا تقرر اس مہم کے واسطے سُن کر اس کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے سرداروں نے اپنی اور اپنی پوری قوم کی خدمات اس کے سپرد کرنا چاہیں مگر اس نے یہ خیال کر کے کہ اگر پٹھانوں کی یہ یک جہتی جہانگیر کے معاینہ میں آگئی تو غضب ہو جائے گا انھیں ٹال دیا مگر اسی زمانے میں جہانگیر و شاہجہاں میں ان بن ہو گئی اور جہانگیر کو خود اس کی مدد کی ضرورت پڑی تو یہ واپس بلا کر آگرہ کے قلعہ و خزانے کی حفاظت پر مامور ہوا پھر مہابت خاں کی معزولی پر شاہزادہ پرویز کے پاس دکن بھیجا گیا اور اس شہزادے کی وفات پر دکن کے کل کاروبار کا مالک بنا دیا گیا - اس زمانے میں یہ حبش خاں حبشی اور اسکی بیوی کے فریب میں آکر تین لاکھ ہوں سالانہ کے معاوضہ میں سارا علاقہ دکن نظام الملک کے سپرد کر کے برہان پور چلا آیا -

اسی زمانے میں جہانگیر کی وفات کی خبر پا کر شاہجہاں نے اسے اپنے پاس بلایا مگر اسے داور بخش کے بادشاہ ہونے کی غلط فہمی اور شاہجہانی دربار میں مہابت خانی رسوخ کے رشک نے شاہجہاں کی خدمت میں حاضر نہ ہونے دیا - اسی زمانے میں مخبروں نے خبر پہونچائی کہ شاہجہاں نے مہابت خاں کو مالوہ میں آپ کے اہل و عیال کو گرفتار کرنے بھیجا ہے تو یہ فوراً ایک بڑی فوج کے ساتھ مالوہ پہونچا یہاں کی رعایا اور شاہی لشکر نے اس کا ساتھ دیا اور شاہجہان سے لڑنے پر آمادگی ظاہر کی - مگر شاہجہاں سیدھا

آگرہ چلا گیا اور امرائے شاہی و رعایا و اہل لشکر یہ خیال کرکے کہ خان جہاں ایک بات پر قائم نہ رہے گا اور ہم لوگوں کے ماتھے پر مفت میں کلنگ کا ٹیکا لگے گا اس سے علیحدہ ہوگئے

اسی زمانے میں یہ معلوم کرکے کہ داور بخش کی بادشاہت آصف خاں کی مکاری اور دراصل شاہجہاں کی بادشاہت کی تمہید تھی اس نے اپنے وکیل کے ذریعے سے بہت بڑا پیشکش مع مروارید کے سہرے کے شاہجہاں کے حضور میں روانہ کیا۔ شاہجہاں نے یہ نذر قبول کرکے اور اس کی بدسلوکی سے اغماض کرکے خلعت کے ساتھ سابقہ خطابات بحال رکھ کر مالوہ کی صوبہ داری بھی بخشی۔ تخت نشینی کے دوسرے سال جب یہ حاضر دربار ہوا تو شاہجہاں نے مہابت خاں کو (جو کسی کے سامنے اپنا سر خم کرنا اپنی ہتک سمجھتا تھا) محض اس چشمک کے خیال سے جو ان دونوں کے دلوں میں قائم ہوگئی تھی دہلی روانہ کرکے دربار میں وہی جگہ عطا کی جو جہانگیر نے اس کے واسطے مخصوص کی تھی مگر اب وہ جہانگیر والی بات کہاں سے آتی نہ وہ قدح باقی تھا اور نہ وہ ساقی آخر چند دنوں کے بعد دونوں کی خاطر میں غبار آگیا اور اس کا اس طرح ظہور ہوا کہ ایک دن شاہجہاں نے اس سے یہ کہکر کہ حضور میں حاضر رہنے کے زمانے میں اس قدر لشکر رکھنے کی ضرورت نہیں اس کا لشکر برطرف کرا دیا پھر اس کی عمدہ عمدہ جاگیریں مختلف حیلوں سے دوسرے شخصوں کو عطا کیں۔ یہ سب باتیں سمجھتا مگر اُف نہ کرتا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایک دن مخلص بیگ کے بیٹے نے ازراہ خوش طبعی اس کے کسی لڑکے سے یہ کہہ دیا کہ تیرا باپ دو چار روز میں گرفتار ہونے والا ہے اس کی خبر لے لڑکے نے یہ خبر اسے پہونچائی اور یہ اس خبر کو سن کر جس کی کوئی اصلیت نہ تھی خانہ نشین ہوگیا۔ شاہجہاں نے اسلام خاں کو بھیج کر اس خانہ نشینی کا سبب دریافت کیا تو اس نے کل حال ظاہر کرکے عرض کرایا کہ اگر اعلےٰ حضرت خود اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا امان نامہ غلام کے پاس ارسال کردیں گے تو اُسے اطمینان ہو جائے گا۔ شاہجہاں نے اسے مطمئن کرنے کے واسطے اپنے ہاتھ سے امان نامہ لکھ کر بھیج دیا مگر پھر بھی اس کا توہم دور نہ ہوا اور روز بروز بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنے کل مال و اسباب کی فہرست قلمبند کرکے آصف خاں کے توسط سے شاہجہاں کے سامنے بطور نذر پیش کرائی اور اسی کے ساتھ یہ اطلاع دینے کر کہ میں آپ کے ملک میں رہنا نہیں چاہتا مع اپنے اعزہ

و خاص ملازموں کے ڈنکا بجاتا ہوا شہر سے نکل کھڑا ہوا۔

شاہجہاں چونکہ امان دے چکا تھا لہذا اس وقت اسے روکنا مناسب نہ سمجھا مگر جب یہ شہر سے باہر جا چکا تو امرا کو اس کے تعاقب میں روانگی کا حکم دیا۔ شہر پناہ سے باہر نکل کر اس نے بآواز بلند یہ الفاظ شہر کی جانب رُخ کرکے کہے "خداوندا! اپنے اس عاجز بندے کی نیت کو تو ہی بہتر سمجھتا ہے۔ تیرا یہ ناچیز بندہ محض اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے شہر سے باہر نکل رہا ہے۔ نہ کسی فتنہ و فساد و بغاوت کے قصد سے"۔ یہ کہہ کر پھر اُسی شان سے آگے بڑھا تو دھولپور میں جا کر ٹھہرا یہاں یہ دریا کو پار کرنے کا انتظام کر رہا تھا کہ شاہی لشکر نمودار ہوا اور لڑائی شروع ہوگئی۔ اس لڑائی میں اس کے کئی لڑکے اور بہت سے اعزا و اقربا کام آئے مگر یہ خود دریا کو پار کرکے گونڈوانہ کے جنگلوں سے گذرتا ہوا نظام الملک کے علاقے میں جا پہونچا۔ نظام الملک کو اس کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اپنے امرا کو بھیج کر اسے اپنے پاس بلوایا۔ اور جب یہ حاضر دربار ہوا تو اس کی تعظیم و تکریم کرکے اپنے برابر مسند پر بیٹھنے کی جگہ دی۔ پھر بہت سا زر و جواہر پیش کرکے اس کے رفیقوں اور عزیزوں کو حسب مرتبہ جاگیریں و خدمتیں عطا کیں۔

چند دنوں کے بعد جب شاہجہاں اس کے استیصال کے واسطے بذات خود برہان پور میں وارد ہوا تو یہ چالیس ہزار سواروں کا لشکر لے کر اُس کے مقابلہ کو چلا۔ مگر جب شاہی فوجوں کے قریب پہونچا تو یہ اپنی پالکی میں بیٹھ کر حقہ پیتا ہوا لشکر کے ساتھ چلا اس کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس کے لڑکے عزیز خاں نے عرض کیا کہ اگر لڑائی کا قصد ہے تو گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہو کر تشریف لے چلئے اور اگر کچھ اور ارادہ ہے تو اپنے ساتھ سارے عالم کو برباد نہ کیجئے۔ عزیز خاں کا یہ سوال سُن کر اس نے کہا "غالباً تمہارا خیال ہے کہ میں اس لشکر سے اپنے آقا پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہوں حاشا و کلا میرا یہ گمان نہیں ہاں اسقدر کثیر لشکر لانے سے میری یہ خواہش ضرور ہے کہ اپنے آقا سے صلح کرکے تم لوگوں کے واسطے روزگار کا ذریعہ پیدا کر دوں اور خود مکہ معظمہ چلا جاؤں"۔ عزیز خاں ان باتوں کو سُن کر خاموش ہو گیا مگر جب اس تذکرہ کا چرچا فوج میں ہوا تو وہ سارا لشکر جو اطراف ملک سے جمع ہوا تھا درہم و برہم ہو گیا۔ خان جہاں اپنے ساتھیوں کی یہ حالت دیکھ کر اور برسات کا موسم سر پر آ جانے کی وجہ سے پھر دکن واپس گیا۔

شاہجہاں کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے ارادت خاں ناظم دکن کو اعظم خانی کا خطاب مرحمت کرکے کل فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور خود اُس کی ماتحتی میں بیس ہزار سوار جن میں بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور مشہور مشہور نبرد آزما امرا و بعدی تھے دےکر آگے بڑھنے کا حکم دیا پھر اس کے عقب میں راجہ گج سنگھ کو پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کرکے ہدایت کی کہ وہ اعظم خاں سپہ سالار کے مشورہ کے موافق اپنے فنون سپہ گری کے جوہر دکھائے۔ اس کے بعد تیسری فوج جو اسی تعداد میں تھی مرتب کی اور اس کا سردار شایستہ خاں خلف یمین الدولہ آصف خاں وزیر اعظم کو مقرر کیا اور اُسے بھی ہدایت کی کہ ہر کام ارادت خاں خان اعظم کے صوابدید سے کرے اور اُس کے منشا کے خلاف تقدیم و تاخیر عمل میں نہ لائے۔

یہ تینوں فوجیں بہت ہی شان و شوکت سے نظام الملک کے علاقے میں داخل ہوئیں تو معمولی چھیڑ چھاڑ کے بعد دکنی لشکر غائب ہوگیا اور وہاں کی رعایا یہ بلا اپنے سر پر مسلط دیکھ کر اپنے مال و اسباب کے ساتھ جنگلوں میں پناہ گزیں ہوگی خان اعظم پہاڑوں اور جنگلوں میں خان جہاں اور دکنی فوجوں کا سُراغ لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ شاہجہاں نے مُخبروں سے یہ معلوم کرکے کہ شایستہ خاں کی اعظم خاں سے موافقت نہیں ہے عبد اللہ خاں کو اس کے بجائے روانہ کیا۔ اعظم خاں یہ فوجیں لےکر آگے بڑھا تو آبادی نہ ہونے کی وجہ سے شاہی لشکر قحط کی بلا میں مبتلا ہوگیا اور رسد نہ پہونچنے کی وجہ سے سخت تکلیفیں ہونے لگیں۔ یہ تکلیفیں آپس میں نزاع کا باعث ہوئیں۔ اس حالت میں نظام الملک نے اپنا لشکر شاہی لشکر پر چھاپا مارنے کو روانہ کیا۔ اعظم خاں نے یہ مصیبت بہت ہی استقلال سے برداشت کی اور دشمنوں کو شکست دےکر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ شاہجہاں کو شاہی لشکر کے تفرقہ کا حال معلوم ہوا تو اُس نے یہ خیال کرکے کہ یہ مہم بغیر آصف خاں کے سر نہ ہوگی۔ اسے سپہ سالار بنا کر اس طرف روانہ کیا۔ اعظم خاں کو اپنے تغیر کی خبر ملی تو اس کی رگ حمیت جوش میں آئی اور قبل اس کے کہ آصف خاں پہونچے اپنے جاسوسوں سے خان جہاں کا پتہ لگا کر ایک دن میں تین منزلوں کا سفر طے کرکے اپنے چیدہ چیدہ سواروں کے ساتھ خان جہاں کے سر پر جا پہونچا خان جہاں اس زمانے میں بیڑ کے پہاڑی علاقے

کے ایک محفوظ مقام میں آرام سے بیٹھا تھا اور اس وقت اُس کے پاس اس کے خدمتگاروں کے علاوہ چار سو سواروں سے زیادہ نہ تھے مگر موت کو سر پر دیکھ کر مردانہ وار مقابلے کو نکلا اور تھوڑی سی دیر کے بعد شکست کھا کر پہاڑوں میں بھاگ گیا - اعظم خاں خاں جہاں سے مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا کہ راستے میں خاں جہاں کے بھائی بہادر سے بہادر خاں رہیلہ کی جو شاہی فوج کا سردار تھا مڈبھیڑ ہو گئی اور آ لی گئی بہادر کے سر ہو گئی - خان جہاں دشمنوں سے بچ کر دولت آباد پہونچا تو یہاں اس کا بھاگا ہوا لشکر پھر جمع ہوا اب دولت آباد اس کی وجہ سے سارے ہندوستان کے پٹھانوں کا مرکز بن گیا - یہ لوگ شمالی ہندوستان سے جوق جوق اس کوشش میں آئے کہ خان جہاں کو بادشاہ بنا کر شیر شاہ کی طرح سے ہندوستان کو مغلوں کی دست و برد سے نکالیں - اور ایک مرتبہ کوشش کر کے پھر مغلوں کو افغانی تلوار کا مزا چکھا دیں -

مگر جب خان جہاں سے اس کا تذکرہ ہوا اور تاج شاہی اُس کے سر پر رکھنے کا ارادہ کیا گیا تو اُس نے جواب دیا کہ میری عمر کا اب پچاسواں سال ہے اور معلوم نہیں کہ میرے بعد میری اولاد میں سلطنت کی قابلیت ہو یا نہ ہو اگر اُن میں قابلیت نہ ہوئی تو یہی مغل ساری افغان قوم کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں ذلیل کر کے شہروں اور دیہاتوں سے باہر نکالیں گے اور جب یہ مصیبت پیش آئے گی تو آپ ہی حضرات اور آپ کے اہل و عیال میرا نام لے لے کر زمین پر جوتیاں مار مار کر مجھے طرح طرح کے ذلیل خطابوں سے یاد کریں گے لہذا میں افسوس کے ساتھ اس عزت سے دست بردار ہوتا ہوں اور صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے ان ذلیل خطابوں اور ایسی جوتیوں کی برداشت نہیں - اس کا یہ صاف جواب سن کر وہ بڑے بڑے پٹھان جو دور دراز مقامات سے اپنی قوم کی بادشاہی کے خواب دیکھتے ہوئے آئے تھے اپنی عزت و آبرو کے بچانے کے خیال سے چلتے بنے - اسوقت نظام الملک نے بھی اسے بے یار و مددگار دیکھ کر اپنی نگاہیں بدل لیں - خان جہاں یہ امر برداشت نہ کر سکا اور افغانستان کے ارادے سے مالوہ کی جانب روانہ ہوا -

اس سفر میں اُس کے ہمراہ دریا خاں مع اپنے لشکر کے اور اس کے بیٹے و دیگر متعلقین بہت سے مال و اسباب کے ساتھ تھے شاہجہاں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو عبداللہ خاں کو اس کے تعاقب میں روانہ کر کے حکم دیا کہ یہ نربدا کو عبور نہ کرنے

پائے ۔ مگر خان جہاں جلد کاٹ کر بخیریت تمام دہرم پوری گھاٹ سے دریا کو پار کرکے دیبال پور میں ٹھہرا ۔ یہ اطلاع شاہجہاں کو ہوئی تو اُس نے مظفر خاں بارہہ کو بھی بہت سا لشکر دے کر اس کی تخریب کو روانہ کیا عبد اللہ خاں اس کے پیچھے پیچھے دیبال پور پہونچا تو یہ اجین کو لوٹتا ہوا تو لاہی گیا یہاں مظفر خاں کا سامنا ہوا تو یہ جان بچا کر سامنے کا راستہ چھوڑ کر سرونج میں ہو رہا یہاں کے شاہی لشکر نے اس سے مقابلہ کرنا چاہا مگر اس نے اس کی کچھ پروا نہ کرکے پچاس شاہی ہاتھی اپنے قبضے میں لے کر آگے کی راہ لی ۔ اب شاہی فوج بہت مستعدی سے اس کے استیصال پر آمادہ تھی اور یہ جس طرف جانا چاہتا ادہر وہ سد راہ ہوتی اس مجبوری میں اسے بندیلکھنڈ کے راجہ بکرماجیت کا خیال آیا اس راجہ نے جب یہ آگرہ سے بھاگا تھا اور شاہی فوجوں نے اس کا لشکر تباہ کر دیا تھا اسے بہت ہی عزت و احترام سے اپنے قلعہ میں جگہ دے کر اس کے دکن تک پہونچنے کا انتظام کر دیا تھا ۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے اُس طرف کا عزم کر دیا مگر اب راجہ بکرماجیت کا وہ حال نہ رہا تھا وہ اس کی ضیافت اور خاطر داری کی پاداش میں عمال شاہی کے ہاتھوں کافی سزا بھگت چکا تھا خان جہاں کی آمد کا حال سُنکر اپنے لشکر کو سرراہ کمیں گاہ میں بٹھا کر منتظر ہوا کہ جس وقت خان جہاں اس کے علاقے میں پہونچے گرفتار کرا کے شاہجہاں کے پاس بھیج دے ۔

خان جہاں جنگلوں میں چھپتا اور دشمنوں سے بچتا پناہ کی اُمید میں اس کے علاقہ میں پہونچا تو اسے کسی ذریعہ سے راجہ کے اس بد ارادے کی خبر ہو گئی اور وہ اُس مقام سے کترا کر جلدی جلدی اُس کے علاقے سے باہر ہو گیا مگر اس کا وفادار سردار دریا خاں جو بطور چند اول کے اُس کے پیچھے آ رہا تھا اُس کے سامنے جا پڑا راجہ کی فوج نے اسی کو خان جہاں سمجھا اور بازار دار و گیر گرم کر دیا راجہ کو دشمنی پر آمادہ دیکھ کر دریا خاں بھی داد مردانگی دینے لگا یہ بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا کہ پیشانی پر گولی لگنے سے جان بحق ہوا مگر اس کے

ساتھیوں نے میدان نہ چھوڑا اور آخر میں جب اُمید نہ رہی تو غیرت میں آکر اپنی بیوی بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے غرق بحر فنا ہوے - راجہ نے اس کا اور اس کے لڑکے کا سر کاٹ کر شاہجہاں کی خدمت میں بھیجا اور اس صلے میں جنگ راج کا خطاب پایا اس لڑائی سے اگرچہ خان جہاں کو راجہ کی سرحد سے نکل جانے کا موقعہ مل گیا مگر دریا خاں کی موت نے اس کی کمرہمت توڑ دی اور شاہی فوج نے پیچھا نہ چھوڑا آخر مجبور ہو کر اس نے اپنا جلوسی سامان چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی مگر دشمنوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور اسے لڑنے پر مجبور کیا یہ جان سے تو عاجز ہی تھا بیدھڑک شاہی فوج پر جا پڑا اور ایسے مردانہ وار حملے کئے کہ شاہی فوج کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا مگر کب تک ایک کی دو اور دو اور دو کی دو اچار آخر یہاں سے بھی زک اٹھا کر کالنجر کی طرف بھاگا - یہاں کے حاکم سید احمد نے اسے اپنے علاقے سے گذرنے نہ دیا اور اس ناکام کوشش میں اس کے بہت سے ساتھی اور دو لڑکے اور کئی قریبی عزیز ان لوگوں سے لڑتے ہوے مارے گئے اور یہ خود بیس کوس بھاگ کر ایک تالاب کے کنارے مقیم ہوا - یہاں ٹھہر کر اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کرکے اپنا کہا سنا معاف کرا کے کہا کہ شاہی فوج میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں - اور مجھ میں اب بھاگنے کی تاب نہیں - لہذا جسے میرے اسباب میں سے کسی چیز کی ضرورت ہو وہ لے کر چلا جائے اور مجھ مایوس زندگی کو میرے حال پر چھوڑ دے " اس کی یہ تقریر اور ساتھ چھوڑنے کے واسطے غلیظ قسمیں سُن کر جن لوگوں کو اپنی جان عزیز معلوم ہوئی وہ چلے گئے اور جو اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور اس بُرے وقت میں بھی اس کا ساتھ چھوڑنا نہ چاہتے تھے رہ گئے - اس بات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ شاہی فوج نمودار ہوئی اور یہ لوگ اسی حال میں اُس سے لڑنے لگے - آخر دو دو چار چار کرکے سب ڈھیر ہو گئے خان جہاں میں جب تک قوت رہی بڑھ بڑھ کر حملے کرتا رہا اور جب مجبور ہو گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر ہاتھ پاؤں ہلانے لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے ڈھیر ہو گیا مظفر خاں نے اس کا سر کاٹ کر شاہجہاں کے سامنے لے جا کر پیش کیا - اور اس نے بعد ملاحظہ حکم دیا کہ یہ سر نیزہ پر رکھ کر بڑے بڑے شہروں میں پھرا کر اس کے خاندانی مقبرہ میں دفن کیا جائے - وفات کا مادہ تاریخ "کہ آہ و نالہ از افغان برآمد" ہے -

مورخین اس کے خاطی اور بے خطا ہونے میں طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے

ہیں مگر ہم خود شاہجہاں کا قول جو اس کے خاطی اور غیر خاطی ہونے کا پورا ثبوت ہے پیش کر کے اس کے حال کو ختم کئے دیتے ہیں۔ شاہجہاں نے جب اس کے قتل کے بعد اس کا خطاب خان جہاں مظفر خاں بارہہ کو دیا تو اس سے فرمایا کہ یہ خطاب اس شخص کا ہے جس کی ایک نگاہ کرم کا سارا زمانہ اُمیدوار رہتا یہاں تک کہ خود اینجانب اور سارے شاہزادے متمنی رہتے کہ وہ ہم لوگوں کی طرف توجہ کرے مگر وہ اپنے استغنا کی وجہ سے کسی سے بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھتا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ آسمان نے گردش کھا کر زمانے کا ورق پلٹ دیا اور وہ لوگ ہمسری کرنے لگے جن کی یہ قدرت بھی نہ تھی کہ اس کے دربار میں قدم رکھ سکیں۔ یہ نوبت یہیں تک رہتی تو غنیمت تھی مگر بعض لوگ اس سے بھی زیادہ بڑھ گئے اور یہی باعث اس کی بے اخلاصی کا ہوا۔ چونکہ غیور تھا لہٰذا اُس کا ضمیر اس کی برداشت نہ کر سکا اور اس ذلت کی زندگی سے اپنی جان دیدینا بہتر سمجھا۔ اور وہی کر دکھایا جو ایک غیرتمند دل رکھنے والا شخص کر سکتا تھا۔"

خان جہاں بہت ہی حلیم اور بردبار مشہور تھا کبھی کسی شخص کی بُرائی نہ کرتا مذہباً سنی تھا مگر اہل ایران کو بہت دوست رکھتا اور ان کی بے انتہا خاطر و تواضع کرتا۔ درویشوں کی عزت کرتا اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتا۔ جب دکن میں رہنے کی نوبت آئی تو شیخ فضل اللہ برہان پوری کی صحبت میں رہ کر تصوف کی طرف مائل ہوا اور اکثر ساری ساری راتیں علما و درویشوں کی صحبت میں گذار دیتا۔ اسی صحبت کے نتیجے میں اسے دنیا سے تنفر ہو گیا اور ہر دنیاوی شے کو ہیچ سمجھنے لگا۔ اس کے ماہانہ اخراجات تقریباً ایک لاکھ روپیہ ماہوار تھے اولاد کی کثرت تھی جو زیادہ تر آخری لڑائیوں میں کام آئی اور جو باقی بچی اُسے نام و نمود حاصل کرنا نصیب نہ ہوا۔ اس نے اپنے ایک لڑکے کو جسے سب سے زیادہ چاہتا تھا اور جس کا نام اپنے نام پر جاں نجاناں رکھا تھا اپنی حالت سقیم دیکھ کر اُن لوگوں کے ساتھ دریا خاں کی بیوی کے پاس روانہ کر دیا جنھیں آخر وقت میں قسمیں دے دے کر اپنے ساتھ سے جدا کیا تھا مگر اس عورت نے بجائے پناہ دینے کے اُسے اپنے بھائی بہادر خاں کے پاس گرفتار کر کے بھیج دیا اور بہادر خاں نے اُسے اسی طرح پابزنجیر بجا کر شاہجہاں کے سامنے پیش کیا۔

تصانیف مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم

تاریخی ناول

1. الفانسو
2. ایام عرب جلد اول
3. بابک خرمی سرود جلد
4. جویائے حق حصہ اول
5. زوال بغداد
6. ملا پیرہ
7. عزیزہ مصر
8. رومتہ الکبریٰ
9. مفتوح فاتح
10. فلپانا
11. فلورا فلورنڈا
12. لعبت چین
13. مینا باز
14. بنکی کا بیل

خیالی ناول

1. آغا صادق کی شادی
2. اسرار دربار حرامپور حصہ
3. اسرار دربار حرامپور حصہ
4. حسن کا ڈاکو کامل
5. دنیا کی محبت
6. غیب دان دولہن

تواریخ

1. تاریخ خلافت
2. صقلیہ میں اسلام
3. عرب قبل اسلام
4. عصر قدیم

5. مسیح و تثلیث
6. تاریخ یہود

سوانح عمریاں

1. ابوبکر شبلی
2. افسانہ قیس
3. حسن بن صباح
4. خواجہ معین الدین چشتی
5. تذکرہ ...
6. سیدہ بنت حسین
7. شیر بی بی ملکہ ...
8. جون آف آرک
9. قرۃ العین
10. ابوالحسین
11. ذی النورین
12. سیر علما

متفرق تصانیف

1. اسپتال
2. زمانہ اور اسلام
3. شب غم
4. ... کا قانون ...
5. انکم ...
6. ...
7. ...
8. معاشرت
9. سیر علما
10. ... کی ... برکت
11. ...
12. معیار زندگی

13. ہندو دھرم کا اردو کو تعلق
14. معتزلہ
15. ہندوستان کی موسیقی

مضامین شرر

1. شاعرانہ و عاشقانہ
2. تاریخی و جغرافی
3. سیر و حال
4. ...
5. ...
6. ...

دلگداز کی مکمل جلدیں

1. جلد دلگداز ...
2. جلد سنہ ...
3. جلد سنہ ۱۸۹۵
4. جلد سنہ ۱۹۰۵
5. جلد سنہ ۱۹۰۶
6. جلد سنہ ۱۹۱۰
7. جلد سنہ ...
8. جلد سنہ ...
9. جلد سنہ ۱۹...
10. جلد سنہ ...
11. جلد سنہ ...
12. جلد سنہ ...
13. جلد سنہ ...
14. جلد سنہ ...
15. جلد سنہ ۱۹۲...
16. جلد سنہ ۱۹۲...
17. جلد ۱۹۲۹
18. جلد دلگداز سنہ ...
19. جلد سنہ ...
20. منتخب مضامین

تصانیف مولوی محمد صدیق حسن صاحب

1. ... حصہ دوم
2. ... سوم
3. ... چہارم
4. ... پنجم
5. ... ششم
6. ... ہفتم
7. ... ہشتم
8. ...

تصانیف مرزا محمد عسکری صاحب

1. ...
2. مرزا غالب کی شاعری

تصانیف حکیم سراج الحق صاحب

1. ... حصہ اول
2. ... دوم
3. ... سوم
4. ... چہارم
5. ... پنجم
6. ... ششم
7. ... ہفتم
8. ...
9. ...

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ دلگداز اورنگ آباد دکن۔

دلگداز

(۱) یہ رسالہ مولانا شررؔ مرحوم کی یادگار میں ماہانہ شایع ہوتا ہے

(۲) اس میں ادبی اور تاریخی مضامین ہوتے ہیں۔

(۳) ایڈیٹر کے علاوہ دیگر مضمون نگار اصحاب کے مضامین بھی شایع ہو سکیں گے۔

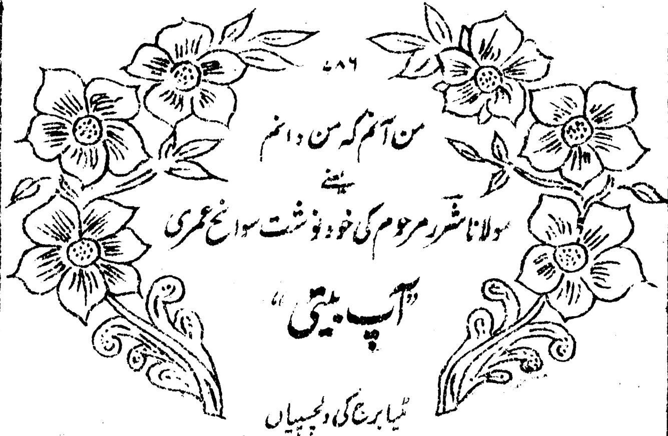
(۴) ہر رسالے کا حجم کم سے کم ۴۲ صفحے ہوتا ہے۔

(۵) چندہ سالانہ مع محصول ڈاک ایک روپیہ آٹھ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) وی پی کی صورت میں ۳ر وی پی کی رجسٹری کے شامل کرکے ایک روپیہ گیارہ آنے کا وی پی ہوگا۔ دعلاقہ سرکار عالی میں وی پی ایک روپیہ چودہ آنے سکۂ عثمانیہ کا ہوگا۔

(۶) جملہ خط و کتابت محمد صدیق حسن ایڈیٹر دلگداز اورنگ آباد دکن کے پتہ سے کی جائے۔

(۷) اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحے کے چار روپیہ اگر زیادہ مدت کے لیے اشتہار دیا جائے گا تو اس اُجرت میں ۶ ماہ کے لیے ۱۰ فیصدی اور ایک سال کے لیے ۱۵ فیصدی کمی کر دی جائیگی۔

(۸) ایک صفحے سے کم اشتہار نہ لیا جائے گا اور اُجرت ہر صورت میں پیشگی لیجائیگی۔



مٹیا برج کی دلچسپیاں

یہ میں بتا چکا ہوں کہ منشی السلطان بہادر بڑے نیک نفس فیاض اور سچے مسلمان تھے اُن کے معمولات میں یہ بھی تھا کہ روز بلاناغہ دن کو دو گھنٹہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے میں صرف کرتے۔ وہ پڑھتے جاتے اور خود ہی مطلب بیان کرتے۔ اور والد محترم اُستاد کی حیثیت سے اُن کے بیان کی تصدیق یا تصحیح کرتے۔ حکیم محمد لٰسین صاحب خیر آبادی بھی ایک ذی علم بزرگ اس صحبت میں شریک رہتے۔ اور میں بھی موجود رہ کے سُنتا مگر بجز سُننے کے بول نہ سکتا۔

منشی السلطان والی مسجد میں حافظ باب اللہ صاحب جو نیز مجسم اور نیک بزرگ تھے نماز پڑھایا کرتے۔ اور اُن سے مجھ سے ایسی صحبت تھی کہ مدت تک بالالتزام مسجد ہی میں سویا کیا۔ اُنھیں کے ساتھ پانچوں وقت نماز پڑھتا۔ اور اُن کی دین داری کی باتیں سُنتا۔

حافظ باب اللہ کے علاوہ اُنکے ہم وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے رہنے والے ایک اور بزرگ تھے حافظ الٰہی بخش۔ وہ بڑے خوش اوقات پاک باطن بزرگ ہونے کے علاوہ سورۂ یٰسین کے عامل تھے۔ اور چند غریب مسلمان خصوصاً مسلمان دھوبی اُن کے مرید تھے۔ حافظ الٰہی بخش صاحب کا اگرچہ ذہن اچھا نہ تھا مگر علم کا بڑا شوق تھا۔ اِسی شوق میں والد کے شاگرد ہوئے اور مجھ سے بڑے بھائی کا سا برتاؤ کرنے لگے۔ اپنے گھر میں

لے گئے۔ بیوی سے ملایا۔ جو میرے حال پر شفقت مادرانہ فرماتیں۔ اُنھوں نے مجھے قرآن مجید بھی اوّل سے آخر تک پڑھا دیا۔ اور چند روز بعد فارسی اور عربی کی کتابیں مجھ سے پڑھنے لگے۔

مگر اس دینداری کے رُخ کے ساتھ اسی زمانے میں میری زندگی کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ منشی السلطان کے بیٹے سردار مرزا صاحب کو جو والد کے شاگرد تھے۔ بٹیربازی کا بیحد شوق تھا۔ بادشاہ کے بڑے بیٹے مرزا ولی عہد بہادر کا جب انتقال ہوا تو اُن کے سب بٹیر اُنھوں نے نیلام میں خرید لیے۔ چار پانچ بٹیرباز جو جانور بازوں میں نوکر تھے ہر وقت اُن کی صحبت میں رہتے۔ اور جب دیکھیے بٹیروں ہی کا چرچا ہو رہا ہے۔ ہر جمعہ کو داروغہ عباس علی خاں کے مکان پر جا کے بڑی بڑی بازیوں پر بٹیر لڑاتے۔ میں جب سبق پڑھ کے آتا تو اس صحبت میں شریک ہو جاتا۔ خود بھی بٹیر پالتا اور بالالتزام پالیوں میں جاتا۔ جس میں بٹیربازوں کی حالت اور بازی بدنے والوں کے جوش و خروش سے وہ ہنگامہ مچتا جو مجھے زندگی بھر کبھی نہ بھولے گا۔

سردار مرزا کے بٹیربازوں میں چھوٹے خاں نام ایک بوڑھے شخص تھے جو افیونی تھے اور بٹیروں کے پالنے اُن کا علاج کرنے اور اُن کے تیار کرنے میں اُستاد زمانہ مانے جاتے تھے۔ مجھ سے اُن سے بہت زیادہ ربط ضبط تھا۔ جہاں جاتے میں اُن کے ساتھ ہوتا اور وجہ یہ کہ وہ میرے بٹیروں کو تیار کر دیا کرتے۔ اور بتاتے کہ ان کی کیونکر داشت کی جائے۔

چنانچہ اُنھیں کے ساتھ میں پالی کے علاوہ اور دنوں میں بھی داستان سُننے کے لیے داروغہ غلام عباس کے مکان پر جاتا۔ جس میں علی العموم افیونیوں ہی کا مجمع رہتا۔ اور سچ یہ ہے کہ عجب لطف کی صحبت ہوتی۔ ستر اسی افیونی چار چار پانچ پانچ ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر بیٹھ جاتے، پونڈے کھلتے، بالائی اور شیر مالیں اُڑتیں، افیون گھلتی اور دور کا سلسلہ جاری رہتا۔

ایک داستان گو جو لکھنؤ سے گئے ہوئے تھے درمیان میں بیٹھ کر داستان کہتے۔ اور اس خوبی و فصاحت سے کہ میں حیرت سے اُن کی صورت دیکھا کرتا۔ داستان کے چار فن ہیں۔ رزم، بزم، حسن و عشق اور عیاری۔ ان میں سے دو پچھلے فنوں

کے یہ داستان گو صاحب بادشاہ تھے۔ حسن کا نقشہ کھینچتے تو اُس کی تصویر اُن کے چہرے پر پھرنے لگتی۔ اور چند لمحوں کے لیے وہ نہایت ہی خوبصورت بن جاتے اسی طرح عیاری ایسے عمدہ عنوان سے بیان کرتے کہ چالاکیوں اور عیاروں کے مجسم پُتلے بنا کے آنکھوں کے سامنے کھڑے کر دیتے۔

سچ یہ ہے کہ انھیں داستان گو صاحب کی فصاحت بیانی نے مجھ میں فصاحت زبان کا ذوق پیدا کر دیا جس پر شاہزادوں اور محلات کی صحبت نے جلا دی۔ اپنے ان لٹریری ہمجنسوں سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اسی زمانے میں والد محترم سے کہہ کر نثر نویسی میں لائق الدولہ بہادر کی شاگردی اختیار کر لی جو بادشاہ کے وابستگانِ دامن میں فارسی کے ایک بہت اچھے نثار مانے جاتے تھے۔

مگر اب میری آوارگیوں اور آزادیوں کو دیکھ کر والد اس کے درپے ہوئے کہ میں منشی السلطان کے دفتر بیت الاجرا میں حاضر ہو کر دفتر کا کام کیا کروں جو مجھے نہایت ہی ناگوار تھا۔ آخر منشی السلطان بہادر کے حکم سے دفتر میں جانے لگا۔ چندہی روز بے لطفی کے ساتھ کام کیا تھا کہ ایک بہت ہی دلچسپ شغلہ ہاتھ آ گیا۔

مثل مشہور ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے ویسے ہی مجھے فارسی عاشقانہ عبارت آرائی کے شوق میں یہاں حسن و عشق کا ایک نہایت ہی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا بادشاہ کے نام محلات عالیات اور بیگمات جو خطوط بھیجا کرتیں وہ خطوط بادشاہ کے ملاحظے کے بعد اسی دفتر بیت الاجرا میں محفوظ رکھے جاتے۔ یہ خط جو تو ڈ نامے کہلاتے علی العموم سُرخ اور پر افشاں کاغذ پر ہوتے اور عموماً عاشقانہ انداز سے رنگین عبارت میں لکھے جاتے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہو گی جن کو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے ان میں بڑا لطف آتا۔ افسوس کہ وہ نایاب ذخیرہ خدا جانے کہاں گم ہو گیا۔ آج موجود ہوتا تو شایع کرنے کے قابل تھا۔ اس لیے کہ اُس میں جتنے خطوط تھے سب کسی اچھے انشا پرداز کے لکھے ہوئے تھے۔ اور نہایت زورِ قلم دے کر رنگین عبارتوں میں لکھے گئے تھے۔ اور چونکہ سب مختلف ادیبوں اور نثاروں کے لکھے ہوئے تھے لہٰذا ہر ایک میں ایک جداگانہ جدت طرازی اور تازگی تھی۔ بہر حال میری انشا پردازی کا پہلا نصاب یہی تو ڈ نامے تھے۔ جو ظاہری صورت اور باطنی رنگ عبارت دونوں حیثیتوں سے بہت ہی دلکش تھے۔

شہزادوں کی صحبت اور شب و روز اُن کی محفل عیش میں رہنے سے مجھے اپنی زبان کی اصلاح میں بڑی مدد ملی۔ اتنا ہی نہ تھا کہ میں صرف باہر ہی سے مل کر چلا آتا ہوں بلکہ محل کی خواصیں اور محلداریں بار بار آ کے ملتیں۔ گھنٹوں پاس بیٹھ کے باتیں کرتیں اور میں اُن کے انداز گفتگو اور الفاظ دونوں کو سُنتا اور لطف اُٹھاتا۔ میرے ہم سن دوست شہزادے میرزا جلال بہادر کی والدہ نواب صدر محل نہایت شائستہ اور تعلیم یافتہ بیگم تھیں۔ شعر و سخن میں اُس وقت کے نامی شاعر گلشن الدولہ بہادر کی شاگرد تھیں۔ ان کا دیوان مرتب ہو کر چھپ گیا تھا جس کے اشعار بہت سے لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ اسی تعلیم اور شائستگی کے لحاظ سے اُن کے مزاج میں نہایت ہی نفاست اور نزاکت تھی۔ ستار خوب بجاتی تھیں۔ موسیقی کا اچھا ذوق تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا دوست سمجھ کر میرے حال پر شفقت مادرانہ فرماتیں۔ اکثر اوقات ایسا اتفاق ہوتا کہ میرزا محمد جلال کی طبیعت کچھ ناساز ہوتی تو مجھے بے تکلف اندر بلوا لیتیں۔ اُنکی محلدار جو ایک خوش رو اور رنگین مزاج بوڑھی عورت تھی روز میرا نکاح ٹھہرایا کرتی اور میں اگرچہ دل چاہتا مگر والد کے خوف سے ہمیشہ ٹال دیا کرتا۔ لیکن ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ان باتوں کا میرے مذاق اور زبان پر کیسا اثر پڑا ہوگا۔

ان ہی باتوں کی وجہ سے ان دنوں میری اخلاقی حالت میں عجب متضاد باتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ گھر میں جیسا کہ میں بتا چکا نہایت متقی اور پرہیزگار رہتا۔ یہاں تک کہ بعض زمانوں میں تہجد بھی کم ناغہ ہوتی۔ اس کے مقابل شہزادوں اور محل کی صحبت میں انتہا درجے کا رند مشرب اور بدکار۔ اُن کی محفل عیش میں رہتا اور شاہی باغوں کی سیر کیا کرتا جن کا سلسلہ کئی میل تک چلا گیا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جیسے نزہت بخش مناظر اور پرفضا مقامات اسد منزل، مرصع منزل، آسمانی اور بادامی کوٹھیوں کے باغ دریائے بھاگرتی کے کنارے میری آنکھوں نے دیکھے شاید پھر کہیں نہ نظر آئیں گے۔ الغرض میں ہر قسم کے گناہوں اور سیہ کاریوں میں مبتلا تھا اور کوئی بے شرمی اور معصیت کا کام نہ تھا جو مجھ سے اُٹھ رہا ہو۔ عقاید کی یہ حالت تھی کہ اگرچہ آبائی مذہب حنفی المذہب سُنی تھا۔ مگر خیالات کسی ایک مرکز پر ٹھیرنے نہ دیتے۔ مالا بدمنہ اور شرح وقایہ پڑھنے کے باعث فقہ سے ایک حد تک آشنا ہو گیا تھا۔ مگر عقاید کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اور گو کہ زیادہ تعلیم شیعہ علما سے

پائی تھی مگر مجھے یاد نہیں کہ صحابۂ کرام کی طرف سے کسی قسم کا سوءظن میرے خیال میں پیدا ہوا ہو۔ لیکن اصولی عقائد سے اول تو پوری طرح واقف نہ تھا اور اگر صاحب علم اعزا واقارب اور دوسرے اتقیا و زہاد کی صحبت کے فیض سے تھوڑے بہت اعتقادی مسائل معلوم بھی ہوئے تھے وہ ناقص معقولی تعلیم اور رندانہ صحبت سے مشکوک و مشتبہ تھے سرسید کا نام ان دنوں میں سنا اور اس عنوان سے کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں یہ سن کر میرے خیالات نے یہ مسودہ تیار کیا کہ میں دین داری اور بے دینی کو ملا کر ایک کر دوں گا۔

تاریخ اودھ کا ایک ورق

"نواب وزیر علی خان"

(از جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

ان کا نام وزیر علی خاں تھا۔ یہ شاعر بھی تھے، وزیر یا وزیری تخلص تھا۔ ان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ غریب سیدزادے تھے۔ لیکن نواب آصف الدولہ نے ولادت کے بعد ہی انھیں اپنی فرزندی میں قبول کر لیا تھا اور محل میں شاہزادوں کی طرح ان کی پرورش اور تربیت کی تھی۔ چونکہ نواب آصف الدولہ کے کوئی صلبی اولاد نہ تھی اس لیے نواب وزیر علی خاں کے علاوہ بھی انھوں نے اکثر شرفا وغرباء کے بچوں کو تبنّی کیا تھا جن کی تعداد پچاس ساٹھ تک پہونچتی ہے۔ لیکن نواب آصف الدولہ کو نسبتہً وزیر علی خاں ہی سے زیادہ محبت تھی اور ان تمام لے پالک لڑکوں میں مرزا وزیر علی خاں ہی نے بہت زیادہ شہرت ونام حاصل کیا۔

حلیہ خوبصورت اور ملیح، کشادہ پیشانی اور جامہ زیب، شجاع، ذہین، ذکی و فہیم لیکن نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ مزاج میں ضد کا عنصر بدرجۂ کمال موجود تھا۔ دل میں جو بات سما جاتی تھی پھر ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر وہ دھن نکالے نہ نکلتی تھی۔ سخاوت اور

فیاضی کی خوبیں نواب آصف الدولہ کے صحیح جانشین تھے۔ اپنی حکمرانی کے مختصر دور میں کروڑوں روپیہ پانی کی طرح صرف کر دیا۔ محتاجوں کو غنی، فقیروں کو امیر بنا دیا اور جب زمانہ کی ناموافقت سے معزول ہوئے تو ہرادنےٰ و اعلیٰ برناؤ پیر نے دلی اندوہ و قلق ظاہر کیا۔ فوج کے سپاہی کٹنے مرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن بعض وجوہ ایسے پیش ہوئے کہ کشت و خون کی نوبت نہ آنے پائی۔

تعلیم و تربیت | انھوں نے مروجہ علم و ہنر اور فنِ انشا پردازی کی تعلیم نہایت معقول پائی تھی۔ اُس عہد کے کاملین اُستادی اور معلمی کی خدمت پر متعین ہوئے تھے۔ خود مرزا وزیر علی خاں صاحب ذہن و ذکا رواقع ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی توجہ میں تمام علوم متداولہ اور ہنروں سے بخوبی ماہر ہوگئے۔ خوشنویسی کا فن مرزا محمد علی اعجاز رقم سے حاصل کیا تھا جو اُس زمانے کے مشہور اور بہترین خطاط تھے اور وزیر الممالک کی سرکار سے اعجاز رقم کا خطاب حاصل کر چکے تھے۔ سپہ گری کا فن رستم خاں پھکیت نے سکھایا تھا جو اپنے کمال کی بدولت فردِ فرید مانے جاتے تھے اور اب تک اُن کے نام سے لکھنؤ میں محلۂ رستم نگر موجود ہے۔ مرزا وزیر علی خان مردانہ مشغلوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور فنونِ شمشیر زنی، تیراندازی، چوگاں بازی اور شہسواری سے بدرجۂ غایت واقف تھے۔

یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے نواب آصف الدولہ کو گرویدہ کر لیا تھا، اور وہ ایک موقع پر وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اور رزیڈنٹ کے سامنے اُنھیں اپنا صلبی فرزند تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے تھے، یہی سبب تھا کہ مرزا وزیر علی خاں کی مسند نشینی کے موقع پر مشکلات پیش نہیں آئیں اور وہ بے عذر اودھ کے نواب مان لیے گئے۔

شادی | ۱۲۰۸ھ شعبان کے مہینے میں نواب آصف الدولہ کو مرزا وزیر علی خاں کی شادی کا خیال پیدا ہوا اور اُن کی زوجیت کے واسطے نواب اشرف علی خاں ابن نواب بندہ علی خاں کی صاحبزادی منتخب ہوئیں۔ نواب بندہ علی خاں، نواب برہان الملک اور نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ کی سرکاروں میں کامل رسوخ رکھتے تھے اور داغ و تصحیحہ¹ کی خدمت پر مامور تھے۔

¹ صحیح النسل اور عمدہ گھوڑوں پر اُن کی شناخت کے لیے نشان لگانے کو داغ اور تمام جانوروں میں سے اچھے جانوروں کے منتخب کرنے کو تصحیحہ کہنا اُس زمانے کی اصطلاح تھی۔ ۱۲ خنجر

یہ شادی بڑی دھوم دھام اور شاہانہ تزک و احتشام سے عمل پذیر ہوئی۔ سارے شہر میں آئینہ بندی کی گئی۔ بازاریں دُلہن کی طرح آراستہ ہوئیں۔ راستے کے دونوں طرف ٹٹیاں لگائی گئیں۔ آتش بازی اتنی نفیس بنوائی گئی کہ اُس سے پہلے اور اُس کے بعد کسی نواب یا بادشاہ کی شادی کے موقع پر نہیں دیکھی گئی۔ ایک آتشباز نے عجیب صنعت سے غبارہ بنایا تھا۔ وہ ہوا میں اتنا بلند ہوتا تھا کہ بالکل تارا بن جاتا تھا اور پوری ایک گھڑی تک فضا میں قائم رہتا تھا جس کا تماشہ بڑا ہی دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ برات کا جلوس دولت خانے سے چارباغ تک پھیلا تھا جس کا فاصلہ چھ میل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر جابجا ٹھاکر بنگلے۔ ترپولیا اور خوش نما برج قائم کیے گئے تھے آٹھ روز تک شاہانہ جشن منایا گیا۔ اس شادی کے موقع پر صناعوں اور پیشہ وروں نے اتنا روپیہ پیدا کیا کہ ایک عرصہ تک کے لیے فکرِ معاش سے فارغ البال ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہی خریداری کی وجہ سے اجناس کا نرخ ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ایک پیسہ کی چیز ایک روپیہ کو بھی نہ ملتی تھی۔ تاریخوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے اس تقریب میں چالیس لاکھ روپیہ صرف کیا تھا۔ نواب مظفر جنگ والیِ فرخ آباد اور نواب فیض اللہ خاں فرماں روائے رامپور ایک مہینا پہلے سے حاضر ہو کے شاہی مہمان ہوئے تھے۔ ایک شاعر نے آصف نامہ کے اخیر میں اس شادی کی تاریخ نظم کی ہے ؎

ازیں عقدِ فرخ دلم شاد شد — کہ ایں خانۂ دولت آباد شد
دلم کرد موزوں ز فرطِ طرب — زمن سالِ تاریخ راچوں طلب
بیک بیت گفتم دو تاریخ نغز — سخن را برآوردن از پوست مغز
دہی میمنت یارب ایں عقد را — کہ کرد از دلِ خلق وا عقد را
زروے وفاق و ز روے وداد — کہ کمتر چنیں اتفاق اوفتاد
دگر سال تاریخ آمد بکف — قرانِ دو کوکب بہ برجِ شرف

مسند نشینی اوائل ۱۰ صفر ۱۲۱۲ھ میں نواب آصف الدولہ کی وفات واقع ہوئی۔ اُس وقت نواب وزیر علی خاں اپنے کتب خانے پنج محلے میں فروکش تھے۔ نواب تحسین علی خاں ناظر نے اطلاع بھیجی اور وہ فی الفور بوچہ پر سوار ہو کے پہونچ گئے۔ باپ کی میت دیکھ کر دل بھر آیا۔

گریہ وزاری شروع کی۔ مسند دئے اور بہت روئے۔ لمسڈن صاحب رزیڈنٹ نے نواب بہو بیگم صاحبہ والدۂ نواب آصف الدولہ مرحوم کا استمزاج (برائے مسند نشینی) دریافت کیا۔ چونکہ وہ فرزند کے غم میں مبتلا تھیں اس لیے رزیڈنٹ کو شاہی سرکار کا خیر اندیش تصور کرکے مسند نشینی کے بارے میں اختیار دیدیا۔ رزیڈنٹ نے نواب وزیر علی خاں کو مستحق سمجھ کر عرض کی "اسی کو مسند نشین ہونا چاہیے جو ریاست کا حقدار ہے"۔

ان باتوں کے بعد نواب بہو بیگم صاحبہ نے جواہر علی خاں خواجہ سرا کو حکم دیا کہ نواب مرحوم کے پلنگ پر جو سبز دوشالہ پڑا ہے وہ نواب وزیر علی خان کو اُڑھادو۔ نواب ناظر نے بیگم صاحبہ کے حکم کی تعمیل کی اور گویا یہی دوشالہ مسند نشینی کا خلعت ہوگیا۔ رزیڈنٹ نے دستاربندی کی رسم ادا کی۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں خیرخواہوں نے نذریں پیش کیں شہر میں منادی کی گئی اور نواب وزیر علی خاں صوبہ اودھ کے حکمراں تسلیم کرلیے گئے۔ نواب وزیر علی خاں کے علاوہ جو اور لوگ حکومت کے حقدار یا اُمیدوار تھے وہ اس نعمت سے محروم رہ گئے۔ اس کے بعد باؤلی والے مکان میں باقاعدہ طور پر مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ شعرائے عصر نے جلوس کی معرکہ آرا تاریخیں نظم کرکے پڑھیں اور خلعت و انعام سے سرفراز ہوئے۔ اُن صدہا تاریخوں میں سے ایک یہ ہے

بعدِ نواب آصف الدولہ — کہ صفاتش چو مہر و ماہ جلی ست
گردہ شد جانشیں وزیر علی — مقتضائے مشیتِ ازلی ست
ہست معروف اتفاقِ تاریخ
کہ نبی شاہِ کُل وزیر علی ست

نواب وزیر علی خاں نے مسند نشین ہونے کے بعد سب سے پہلے خواجہ غلام محمد عرف بڑے مرزا کو دیوان خانے کی داروغگی کا خلعت عنایت فرمایا اور بخشی گری کی خدمت فخرالدین احمد خاں بن مرزا جعفر خاں مرحوم کو بخشی۔

نواب وزیر علی خاں کی مسند نشینی سے اختلاف نواب آصف الدولہ کے بھائیوں میں سب سے بڑے نواب سعادت علی خاں تھے وہ ملک داری اور حکمرانی کے امور میں پورا پورا دخل رکھتے تھے۔ اُنھیں اپنے حقوق پر بھروسہ بھی تھا۔ سمجھتے تھے کہ نواب آصف الدولہ کے بعد اودھ کی حکومت میرے ہاتھ میں آئے گی۔ لیکن خدا کی مرضی اس خیال کے

خلاف تھی۔ جب نواب وزیر علی خاں کی نوابی تسلیم کر لی گئی تو انھیں بہت رنج ہوا اور عذر پیش کیا کہ " نواب آصف الدولہ کے کوئی صلبی فرزند نہیں، اور جو تھے بچپنے ہی میں قضا کر گئے۔ اُن کے بعد اودھ کی ریاست پر میرا حق ہے نہ کہ وزیر علی خاں کا۔"
مگر یہ عذر مسموع نہ ہوا اور نقضِ امن کے خیال سے نواب سعادت علی خاں کو شہر سے ہٹا کے بنارس بھیج دیا گیا۔ نواب آصف الدولہ نے اکثر موقعوں پر نواب وزیر علی خاں کو اپنا صلبی فرزند تسلیم کیا تھا۔ نیز نواب بہو بیگم صاحبہ اور بعض ارکانِ ریاست کی راے نواب وزیر علی خاں کے موافق تھی لہٰذا وہی اودھ کے والی بنا دیے گئے۔ اور نواب سعادت علی خاں کی اُس وقت ایک نہ چلی۔

نواب وزیر علی خاں کی بے عنوانیاں | یہ جواں بخت و جواں سال نواب اٹھارہ ۱۸ یا اُنیس ۱۹ برس کے سن میں مسند آرائے حکومت ہوا۔ جوانانہ جوش اور خود مختارانہ حکومت نے بالکل ہی بے قابو کر دیا۔ اُس نے ملک داری کے آئین سے غفلت برتنا شروع کی اور اُس کے نااہل مصاحبوں نے اپنی تباہ کن راے سے اُس کی دبی ہوئی اُمنگوں کو اور بھی اُبھار دیا۔ مسند نشینی کے پانچویں ہی روز سے عیش و طرب کی مجلسیں آراستہ ہو گئیں۔ شباب کا عالم۔ خود رفتگی کا زمانہ اور لکھنؤ سا شہر جہاں پریجمال اور رجاد و نگاہ نازنینوں کی بہتات تھی اور جو نوجوان نواب کو عیش پرستیوں کی ترغیب و تحریص کرنے میں اکسیر ثابت ہوئی اُس پر خود غرض مصاحبوں کی چکنی چپڑی باتیں سونے میں سہاگہ بن گئیں۔ الغرض بزمِ عیش و نشاط گرم ہو گئی۔ ناچ و رنگ شروع ہوا۔ مرزا وارث علی خاں ارباب نشاط کے داروغہ بنائے گئے۔ میر عشرت علی خاص ہمدم مقرر ہوئے۔ نواب تحسین علی خاں نے یہ بے اعتدالیاں دیکھیں تو خیر خواہی کے خیال سے نصیحتیں شروع کیں۔ یہاں مزاج میں ضد کا عنصر تو پہلے ہی سے غالب تھا۔ مزاج ہمایوں میں تکدر پیدا ہوا تحسین علی خاں نے خائف ہو کر نواب تفضل حسین خاں نائب ریاست کے دامن میں پناہ لی۔ نواب وزیر علی خاں کو خبر ہوئی تو چوبدار بھیج کر طلب کیا۔ تحسین علی خاں پر خوف غالب تھا، نواب کی حضور میں حاضر ہونے پر راضی نہ ہوئے۔ نواب تفضل حسین خاں نے اُن کے خوف کے خیال سے کچھ حیلہ و حوالہ کر کے چوبدار کو ٹال دیا اور اُس کے جانے کے بعد تحسین علی خاں کو رزیڈنٹ کے پاس بھیجدیا۔

نواب وزیر علی خاں کے عزل کی تدبیریں

نواب وزیر علی خاں کے جوانانہ جوش اور بعض بے اعتدالیوں سے چند صاحبات محل اور نواب بہو بیگم صاحبہ ناراض تھیں۔ اس خفگی سے جری ہو کر کچھ نمک پروردوں اور بعض امرائے وقت نے نواب وزیر علی خاں کے عزل میں سرگرمی دکھانا شروع کی۔ لیکن نواب وزیر علی خاں نے ان ریشہ دوانیوں کا مطلق اندیشہ نہ کیا بلکہ بدستور لطف زندگی حاصل کرنے میں مشغول رہے۔ ادھر بدخواہوں کی جانب سے ایک اشتہار شایع کیا گیا۔ جس کے ذریعہ سے عوام الناس کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ بھی اُن کے ہمنوا ہو کر نواب وزیر علی خاں کے خلاف احتجاج کریں اور سرکار کمپنی کو اُن کی معزولی پر آمادہ کریں۔ اس اشتہار میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب وزیر علی خاں، نواب آصف الدولہ کے صلبی فرزند نہیں ہیں نہ اُنھیں ریاست کا شرعی حق پہونچتا ہے۔ اُن کے مسند نشین ہو جانے سے حقداروں کی صریح حق تلفی ہو رہی ہے"۔

یہ اشتہار شہر کے تمام گلی کوچوں اور گھر گھر میں پھرایا گیا۔ عوام الناس سے نواب وزیر علی خاں کی معزولی کے لیے دستخط حاصل کیے گئے۔ بعض بیگموں، چند خواجہ سراؤں نیز نواب سالار جنگ اور ان کے فرزندوں نے بھی اس محضر پر اپنے اپنے دستخط ثبت کیے۔ بازار کے چودھریوں اور مہاجنوں کو بھی دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن فوجی افسروں مثلاً عبدالرحمٰن خاں وغیرہ نے اس محضر پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اُنھوں نے کہا کہ "ہم تو مسند وزارت کے نمک خوار ہیں، ہمیں خانگی یا نجی جھگڑوں بکھیڑوں سے کوئی واسطہ نہیں، مسند وزارت پر جو شخص جلوس فرمائے گا ہم اس کی اطاعت اور فرماں برداری کریں گے"۔

کوئی شبہہ نہیں کہ نواب وزیر علی خاں نے ناعاقبت اندیش مصاحبوں کی چاپلوسیوں میں پڑ کے کچھ بے اعتدالیاں کیں۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ فیاضی، سپاہ دوستی، شجاع نوازی اور غریب پروری سے اپنی شخصیت کو فرد فرید ثابت کر دیا۔ وہ باہمت اور باذل نواب تھا۔ اُس نے سخاوت کی خو نواب آصف الدولہ سے میراث میں پائی تھی۔ اس نے برق پا دورِ حکمرانی میں کروڑہا روپیہ اپنے متوسلین اور مستحقین کو انعام واکرام میں دیدیا۔ اُس کی نگاہ میں اشرفیوں کو اتنی اہمیت بھی

حاصل نہ تھی جو بے حقیقت ٹھیکریوں کی ہوتی ہے۔ اور یہ کلیہ ہے کہ عوام الناس سخی کو دوست رکھتے ہیں پھر نواب وزیر علی خاں کی محبوبیت کا فقدان کیسے ہو سکتا تھا

معزولی نواب کو حکمرانی کرتے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ نواب گورنر جنرل کی آمد آمد کی خبر مشتہر ہوئی۔ نواب وزیر علی خاں نے خاندانی روایات کے بموجب اُن کی مہمانداری کا سامان فراہم کیا۔ گورنر جنرل کے قیام کرنے کے واسطے بی بی پور کی کوٹھی تجویز ہوئی جب گورنر جنرل شہر میں وارد ہو کے بی بی پور کی کوٹھی میں مقیم ہو چکے تو نواب کی مخالفت میں خبریں گوش گزار ہونا شروع ہوئیں۔ اُن کا وہ حسب و نسب جو بد خواہوں کی نظر میں تھا رنگ و روغن لگا کے ظاہر کیا گیا اور حقداروں کی حق تلفی کا طویل قصہ سنایا گیا۔ اوّل اوّل تو گورنر جنرل کو حکومت میں دست اندازی کرنے سے تامل رہا۔ مگر جب بد خواہوں نے اپنا بنایا ہوا محضر پیش کیا اور ارا کین سلطنت مثلاً نواب بہو بیگم صاحبہ۔ نواب تفضل حسین خاں نائب السلطنت نواب اشرف علی خاں (نواب وزیر علی خاں کے خسر) نواب حسن رضا خاں۔ راجہ ٹکیت رائے، الماس علی خاں اور تحسین علی خاں ناظر کے دستخطوں پر توجہ دلاتے ہوئے نواب وزیر علی خاں کی معزولی کا مطالبہ کیا تو گورنر جنرل کو مان لینا پڑا اور اُنھوں نے گرد و نواح سے فوج طلب کر کے بی بی پور میں جمع کر لی۔ اُنھیں دنوں میں سونے اتفاق سے نواب وزیر علی خاں کے چیچک نکل آئی اور جو خبریں کان میں پڑتی رہتی تھیں اُن کا سلسلہ بھی قطع ہو گیا۔ جب عزل کا تمام مصالحہ جمع ہو گیا تو گورنر جنرل نے سلطنت کے ارا کین کو جمع کیا۔ اور اُن کے سامنے یہ اہم مسئلہ پیش کیا۔ وہاں تو پہلے ہی سانٹھ گانٹھ ہو چکی تھی سب نے نواب وزیر علی خاں کی مخالفت کی اور اُن کی معزولی کے محضر پر دستخط کر کے مہریں لگا دیں۔ آخر الامر وہی پیش آیا جو مقدر ہو چکا تھا۔

نواب گورنر جنرل نے غور و خوض کے بعد منشی غلام قادر خاں جائسی لمسڈن صاحب رزیڈنٹ کے میر منشی کی معرفت نواب وزیر علی خاں سے کہلوا بھیجا کہ "شرع محمدی کی رو سے متحقق ہو گیا ہے کہ آپ کو دولت آصفیہ میں شرعاً اور عرفاً کوئی استحقاق نہیں ہے جو لوگ حق رکھتے ہیں یعنی نواب شجاع الدولہ کی اولاد ہیں وہ اپنے آبائی ورثہ سے محروم ہیں۔ اس لیے یہ تجویز کی گئی ہے کہ اُن میں سے کسی ایک کو مسند آرائے حکومت

کر لے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے جس سے آپ کی شانِ امارت میں کوئی فرق واقع نہ ہو۔ آپ کو اس واقعہ کا ملال نہ کرنا چاہیئے کیونکہ آپ کے واسطے حشمت کا تمام سامان مہیا رہے گا۔ آپ کے اعزاز و مراتب میں رتی تفریق نہ ہوگی"۔

جب نواب وزیر علی خاں کو اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے فرمایا "جو گورنر جنرل کی مرضی ہے وہی ہوگا"۔ اُسی دن رات کو گورنر جنرل نے نواب وزیر علی خاں کو بی بی پور کی کوٹھی میں بلا بھیجا اور جب یہ تشریف لے گئے تو بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ لیکن اُن نصیحتوں نے زخم کے ساتھ ریزۂ الماس کا کام کیا۔

خانہ زادوں کی رفاقت کا جوش عزل کے بعد ہی مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار کے منتظم خانہ زاد خاں نے اس مضمون کی ایک عرضی نواب وزیر علی خاں کی خدمت میں ارسال کی کہ "جس طرح ہو سکے حضور گھوڑے پر سوار ہو کے گومتی تک چلے آئیں نمک خوار ہاتھی لے کر حاضر ہوتا ہے۔ وہاں سے ہاتھی پر بٹھا کے ابراہیم بیگ توپ خانے کے داروغہ تک پہونچا دیگا پھر ہم لوگ شہر سے باہر نکل کے کھلے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کریں گے"۔

نواب وزیر علی خاں نے اس عرضی کو پڑھ کے بصد حسرت و یاس فرمایا "ملاح اُس وقت کشتی لایا کہ جب ڈوبنے والا تہ پر بیٹھ گیا"۔ کسی مخبر نے گورنر جنرل کو اس رسل و رسائل کی خبر کر دی۔ اُنھوں نے مصلحتاً اُسی وقت نواب وزیر علی خاں کو بی بی پور طلب کیا۔ طلبی کا پیغام پہونچتے ہی نواب وزیر علی خاں چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ نمک خواروں اور خیر اندیشوں نے یہ عرض کر کے روکنا چاہا کہ "اب حضور کا گورنر جنرل کے پاس بی بی پور جانا خطرے سے خالی نہیں ہے"۔ لیکن نواب قاسم علی خاں اور نواب اشرف علی خاں نے جو در پردہ عزل کے خواہاں تھے فوراً گورنر جنرل کی ملاقات کا مشورہ دیا۔ اس پر رسالہ دار عبد اللہ خاں قندھاری نے مکرر دست بستہ التماس کی کہ "حضور! خانہ زاد حق نمک ادا کر چکا اب حضور کو اختیار ہے جس کے شورے کو بہتر اور مفید خیال فرمائیں اُس پر عمل کریں"۔ نواب وزیر علی خاں نے عبد اللہ خاں قندھاری کی صلاح پر عمل نہیں کیا اور نواب گورنر جنرل کی ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔ رسالہ دار عبد اللہ خاں قندھاری نے آخری تسلیم عرض کی اور فوراً خالص پور چلا گیا۔

جب نواب وزیر علی خاں کی سواری بی بی پور پہونچی اور نواب کوٹھی میں داخل ہو چکے

تو گورنر جنرل کے چیف سکریٹری نے نظر بند ہونے کی اطلاع دی۔ اُسی وقت کوٹھی کے چاروں طرف گوروں کا پہرا لگا دیا گیا۔ نواب وزیر علی خاں کی سواری کا ماہی مراتب مع قوم و مخزون واپس ہوا اور اسیری کی خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں عام ہو گئی۔ سُنتے ہیں اُس وقت نواب وزیر علی خاں بار بار آسمان کو دیکھتے اور یہ شعر پڑھتے تھے ؎

اُٹھ گئے محفل سے سارے یار اور اُلجھن پڑی
اے فلک انداز گردش اب تو تجھ کو کل پڑی

کسی نے واقعہ عزل کی تاریخ نظم کی ہے ؎

حرکاتے کہ از وزیر علی — گشت صادر زبس عجیب و غریب
دلِ خلقے ازو بشور آمد — شور صاحب رسید با تقریب
کرد اسیرش بغرۂ شعبان — نرود پیش رفت کس ز نصیب
سالِ تاریخ حبس می جستم
گفت ہاتف عیاں ز لفظِ غریب

جن وابستگانِ دامنِ دولت کو نواب وزیر علی خاں سے خاص [illegible] تھی اور [illegible] کے عزل کو نامستحسن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے عجیب عجیب طور سے اس واقعہ کی تاریخ نظم کی ہے۔ جن سات آدمیوں نے نواب وزیر علی خاں کو مسند سے اُتارنے کی کوشش میں حصہ لیا تھا اُن کو اس نامسعود فعل پر لعنت ملامت کرتے ہوئے اُن کے ناموں کو ہجو ملیح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اگرچہ نواب کے ارادت مندوں نے اس رنگ کی سیکڑوں تاریخیں منظوم کی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہاں ایک تاریخ نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

از سر ہفت نام کور نمک — سالِ تاریخ شد عیاں بیشک
اوّل آں قاتلِ حسن الماس[1] — سرگروہ ہمہ حرام نمک
باز تحسین[2] کہ باد نفرینش — از سماوات ہم ز جن و ملک
فتنہ پرداز ملحدِ کشمیر[3] — کہ شیاطین پرورش از فلک

۱؎ الماس علی خاں خواجہ سرا ۲؎ تحسین علی خاں خواجہ سرا ۳؎ تفضل حسین خاں نائب الریاست۔

آں خرد دشمن و حسیم[۴] و سیم | جہل بسیار و دانشِ اندک
ناقص العقل زنگۂ[۵] نادان | دست بردار شد از اں کودک
راجۂ[۶] ہم داخلِ لئیماں شد | کرد پاسِ نمک ز خاطر حک
دادنِ دختر[۷] و دغا کردن | شرفِ خود شناخت آں مردک

مُہر کردند بر عُزلِ وزیرؔ[۸]
خود سیہ رو شدند زیرِ فلک

اس تاریخ میں یہ صنعت رکھی گئی ہے کہ ساتوں آدمیوں کے ناموں کا پہلا حرف جدا کرکے اعداد جوڑنے سے معزولی کا سنہ پیدا ہوتا ہے۔

بنارس کا قیام سر جان شور نے معزول نواب کے واسطے بنارس تجویز کیا جو ایسے نازک طبع اور نفیس مزاج نواب کے لیے بالکل ہی ناموزوں تھا لیکن زمانے کی ناساعدت نے مجبور کیا اور اودھ سا بارونق ملک چھوڑ کر اُجاڑ بستی (جو نواب وزیر علی خاں کی نظروں میں فی الحقیقت اُجاڑ تھی) بسانا پڑی۔ چالیس ہاتھی۔ خاصے کے دو سو گھوڑے۔ تلنگوں کی دو کمپنیاں اور ریاست و امارت کے جملہ لوازمات، ساز و سامان ہمراہ ہوا۔ بنارس میں بظاہر کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ لکھنؤ سے کروروں روپیہ نقد اور کروروں روپیے کا جواہرات ساتھ گیا تھا عیش و آرام سے بسر ہونے لگی۔ ایک ایک خادم کی شادی بیاہ میں سیر چشمی سے لاکھوں روپیہ صرف کیا۔ جس سے نواب کے جود و کرم کا آوازہ حاتم کی طرح اُن اطراف میں پھیل گیا۔ دُور دُور سے فقرا و مساکین آتے اور کیسہائے خالی کو سیم و طلا سے بھر لیجاتے یہ عجیب بات ہے کہ نواب وزیر علی خاں کی معزولی کی جہاں جہاں خبر پہونچی وہاں وہاں کے لوگ ہمدردی پر آمادہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرد بشر کو نواب وزیر علی خاں سے حُسنِ ارادت تھا۔ لکھنؤ والوں کا یہ حال تھا کہ اُن لوگوں کی مذمت میں ٹھمری۔ ٹپے بنا بنا کے علانیہ گاتے پھرتے تھے۔ جنھوں نے نواب وزیر علی خاں کے خلاف امور عزل میں کوشش کی تھی۔ زبانیں معزول نواب کی مدح و ثنا سے آشنا ہو رہی تھیں۔ انھیں باتوں کا یہ اثر تھا کہ بعض ناعاقبت اندیش مصاحبوں نے نواب وزیر علی خاں کے دل میں

---

۴ نواب حسن رضا خاں نائب (؟) تھے ۵ نواب بہو بیگم صاحبہ ۶ راجہ ٹکیت رائے۔ ۷ نواب اشرف علی خاں (نواب وزیر علی خاں) کے خسر ۸ نواب وزیر علی خاں معزولی نواب ۱۲۱۲ھ

راسخ کردیا کہ "اگر حضور عالی جنگ کرکے ملک واپس لینا چاہیں تو اطراف و جوانب سے امداد پر امداد حاصل ہوسکتی ہے" نواب وزیر علی خاں تو لکھنؤ کے فراق میں تڑپ ہی رہے تھے فوراً نیم راضی ہوگئے اور اُن کے مشورہ دینے والوں نے تعلقداروں اور زمینداروں سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کردیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں نواب وزیر علی خاں کے گرد جم غفیر ہوگیا۔ اُنھیں دنوں میں ایک وکیل کی وساطت سے زمان شاہ والیٔ کابل کے پاس ایک مراسلت روانہ کی گئی۔

جیری صاحب رزیڈنٹ کا قتل شدہ شدہ یہ اخبار جیری صاحب کے گوش گزار ہوئے اُنھوں نے مصلحتِ وقت پر نظر کرتے ہوئے لارڈ ولزلی کو ان واقعات کی اطلاع کی۔ لارڈ ولزلی نے کچھ اپنی مصلحت اور کچھ نواب سعادت علی خاں کے ایما سے نواحِ بنگالہ میں نواب وزیر علی خاں کا قیام مناسب سمجھا۔ جیری صاحب نے نواب وزیر علی خاں کو گورنر جنرل کی رائے سے مطلع کیا۔ نواب وزیر علی خاں کو بنارس ہی کا قیام دوبھر تھا چہ جائیکہ نواحِ بنگالہ کا قیام؟ مزاجِ عالی برہم ہوا اور اُسی وقت سے کوشش شروع کردی کہ نقلِ سکونت نہ ہونے پائے۔ خیر خواہوں نے ہرچند ہاتھ پاؤں مارے لیکن اُن کی کوششیں مشکور نہ ہوئیں۔ جب بنارس چھوٹنے کا یقین ہوگیا تو ایک دن نواب وزیر علی خاں بچاس جاں نثاروں کے ساتھ جیری صاحب کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کے تذکرے ہوتے رہے۔ چائے کا دور چلا۔ اثنائے گفتگو میں انتقالِ سکونت کا ذکر نکل آیا۔ نواب وزیر علی خاں نے دوستانہ شکوے کے طور پر چند کلمے کہے۔ جیری صاحب نے اپنی افسری کے زعم میں گستاخانہ جواب دیئے۔ جس سے نواب وزیر علی خاں کے تیوروں پر بل پڑ گیا۔ اگرچہ اُنھوں نے بات کو رفع دفع کرنا چاہا لیکن طولِ کلام کی نوبت آگئی اور غیور نواب جذبۂ غضب کو دبا نہ سکا اور جیری صاحب کی دریدہ دہنی کا جواب تلوار کی زبان سے دیا۔ جیری صاحب نے سامنے سے بھاگ کر جان بچانا چاہی مگر وقت پورا ہوچکا تھا۔ قضا نے مہلت نہ دی اور عمر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ کپتان کانوی صاحب اور گریم صاحب بھی اسی بنگلے میں موجود تھے۔ نواب کے جاں نثاروں نے جوش کے عالم میں اُن کو بھی قتل کیا۔ اس کے بعد نواب وزیر علی خاں دولت خانے میں واپس تشریف لائے اور اس واقعہ کی خبر عام ہوگئی۔ نواب وزیر علی خاں کے مصاحبین نے اُنھیں صلاح دی کہ مزید جواں مردی

کی بیگم سے امداد طلب کی جائے - چنانچہ نواب وزیر علی خاں اُن کے یہاں تشریف لے گئے اور بیگم صاحبہ سے توپ طلب کی - بیگم صاحبہ نے انگریزوں کے خوف سے انکار کر دیا - وہاں سے مایوس ہو کے پلٹے تو مرزا جعفر (مرزا جواں بخت کے نواسے) کے پاس گئے - اُن کا عنفوانِ شباب تھا - رگ رگ سے جوانی کا جوش اُبلا پڑتا تھا - ذرا سی تحریک ہوتے ہی جسم پر سلاحِ جنگ سج کر لڑنے پر آمادہ ہو گئے - ادھر ہوا خواہوں کی کوشش سے تھوڑی دیر میں جھنڈے کے نیچے ہزاروں آدمی جمع ہو گئے - اس درمیان میں انگریزی فوج بھی اپنا توپخانہ لے کے آ گئی - نواب وزیر علی خاں کی بے قاعدہ فوج، میگزین کی نایابی، توپوں کی کمی اور ایسے ہی ایسے اکثر وجوہ سے انگریزوں کی فتح ہوئی - اصولِ جنگ سے ناواقف سپاہی قواعد داں فوج کے مقابلے کی تاب نہ لا کر متفرق ہونے لگے - اس موقع پر نواب وزیر علی خاں نے جس بے نظیر جرأت و دلیری سے کام لیا وہ اُنھیں کا حصّہ تھا - جاں نثاروں کے منتشر ہونے کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنا ننگ سمجھا اور تلوار سونت کر ہاتھی سے کود پڑے اور تنِ تنہا انگریزی فوج سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا - چند ہوا خواہوں نے دلیر نواب کو بہ اصرار اس قصد سے باز رکھا - اب نواب وزیر علی خاں کے حق میں بنارس کا قیام خطرناک تھا - لہٰذا ترکِ سکونت کا مشورہ قرار پایا - دولت خانے میں جس قدر زر و جواہر موجود تھا کچھ اپنی جیبوں میں بھرا باقی دو سو ہمراہیوں کی کمر میں بندھوایا اور توکل بخدا گھر سے نکل کھڑے ہوئے - دولت خانے میں جو اثاثہ بچ رہا تھا وہ غارت گروں کے ہتھے لگا - دو سو جاں نثار جو سائے کی طرح ساتھ رہنے اور حقِ رفاقت ادا کرنے کا عہد کر کے نکلے تھے زر کی طمع نے اُن کی نیتوں میں بھی خامی پیدا کر دی - اُن کی کمر میں جتنا جواہرات بندھا تھا اُسے لے کر راستے ہی سے کٹ گئے - یہاں تک کہ نواب وزیر علی خاں نے گنگا کو عبور کرنے کے بعد جو مڑ کے دیکھا تو دو سو فدائیوں میں سے صرف بیس سرفروش دامنِ دولت سے لپٹے ہوئے چلے آتے تھے -

راجہ بنارس | اُن دنوں بنارس کے راجہ کی سکونت رائے پور میں تھی - نواب وزیر علی خاں نے اُس کی قدیم خیر خواہی کا خیال کرتے ہوئے وہاں پناہ لینا چاہی - چونکہ انگریزوں سے مخالفت ہو چکی تھی اس لیے راجہ نے نواب وزیر علی خاں کو مہمان کرنے اور لوازماتِ [illegible]

پہاڑوں کے دامن میں پوشیدہ ہونا پڑا۔ پھر گھاگرہ کو عبور کرنے کے بعد راجہ بھوٹ وال کے یہاں ڈیرہ ڈالا۔

راجہ بھوٹ وال | راجہ بھوٹ وال نیپال کی ریاست کا باج گزار تھا۔ وہ نواب وزیر علی خاں کے ساتھ بڑے خلق و اخلاص سے پیش آیا۔ یہ خبر نواب سعادت علی خاں کو پہونچی۔ انھوں نے نواب وزیر علی خاں کی گرفتاری کے لیے قندھاری رسالہ روانہ کیا لیکن بہادر نواب نے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر گرفتار ہونا پسند نہ کیا۔ کھلے میدان میں نکل کر مردانہ وار جنگ کی اور کچھ ایسے جوش سے لڑے کہ مخالف فوج کو شکست دیدی لیکن تقدیر بگڑ چکی تھی چند روز کے بعد راجہ بھوٹ وال بھی مخالفین کے بھڑکانے سے خلاف ہوگیا اور نواب وزیر علی خاں کو وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔

انگریزوں سے مقابلہ | نواب وزیر علی خاں نے راجہ بھوٹ وال کے یہاں سے نکل کر تھوڑا لاؤ لشکر جمع کر لیا اور اُسے لے کر گورکھپور تشریف لائے جہاں انگریزی فوج سے معرکہ پیش آیا اور کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا چونکہ روز بروز روپیے میں کمی واقع ہو رہی تھی اس لیے جاں نثاروں اور فدائیوں نے بھی ساتھ چھوڑنا اور رفاقت سے کنارہ کرنا شروع کیا۔ کئی نازک موقعوں پر نواب وزیر علی خاں کی گزشتہ سخاوتیں آڑے آگئیں اور وہ مخالف فوجوں کے اغماض سے بچ بچ کے صحیح و سالم نکل گئے۔ گورکھپور سے چل کے نانک متھر کے بنوں سے گزرتے اور بھیس کھتہ ہوتے ہوئے آگے بڑھے اور گنگا کو عبور کرتے ہوئے فتح پور سیکری پہونچے۔ لیکن یہاں بھی قسمت نے راستی اختیار نہ کی۔ قضائے مبرم کی طرح انگریزی فوج تعاقب میں لگی رہی۔ کئی مقاموں پر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آئیں لیکن نواب وزیر علی خاں ہر مقام پر لڑ بھڑ کے بچ نکلے۔

حکایت | ایک دفعہ نواب وزیر علی خاں دریا کو عبور کرنے کا قصد کر رہے تھے کہ دفعتہ انگریزی فوج نے وہاں پہونچ کے عقب سے حملہ کر دیا۔ نواب وزیر علی خاں نے گھبرانے یا ہراس ظاہر کرنے کے بدلے فی الفور نیام سے تلوار کھینچ لی۔ دشمنوں کے حملوں کو روکتے، اپنے تئیں بچاتے اور جوابی وار کرتے ہوئے دریا کی طرف بڑھے۔ کنارے پہونچ کر بہ عجلت زین کا بند کاٹا اور گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ پانی چڑھا ہوا تھا۔ بہاؤ کا زور تھا۔ اور ذرا سی لغزش میں بہہ جانے کا خوف تھا۔ لیکن گرفتاری کی ذلت پر عزت اور دلیری کی موت

کو ترجیح دی اور اسی مینظیر ہمت کی بدولت بخیر و خوبی دریا کو عبور کر گئے۔ یونہیں کئی موقعوں پر یکہ و تنہا کئی کئی گاردوں اور پلٹنوں سے مقابلہ کر کے صاف نکل گئے۔ جو اس ناز و نعم کے پلے ہوئے نواب کی شجاعت و بسالت کی روشن دلیل ہے حق تو یہ ہے کہ نواب وزیر علی خاں جس قدر عیش پسند اور آرام طلب تھے اُس سے کچھ زیادہ ہی دلیر اور جفاکش بھی تھے۔ وقت پر کسی بڑے سے بڑے خطرے کو بھی دھیان میں نہ لاتے تھے۔ آگ اور پانی میں بے خوف و خطر پھاند پڑتے تھے۔

گرفتاری | اگرچہ شوریدہ نصیب نواب وزیر علی خاں سنگلاخ راستوں کی ٹھوکریں کھاتے اور مصیبتیں جھیلتے ہوئے بیوات پہونچے مگر وہاں والوں سے میزان نہ بیٹھی تو وہاں سے جے پور کا رخ کیا۔ اُن دنوں جے پور کا راجہ مطلق العنان حکمراں تھا اُسکے کندھوں پر کسی کی ماتحتی کا جوا نہ تھا۔ راجہ کا نام جگت سنگھ تھا۔ نواب وزیر علی خاں کی آمد کی خبر سُن کر بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے استقبال کو نکلا۔ نواب وزیر علی خاں سے بگڑی بدل کے بھائی چارہ پیدا کیا۔ راجہ کی ماں نے نواب وزیر علی خاں کو اپنا بیٹا بنایا اور یوں بظاہر نواب وزیر علی خاں کو تھوڑا بہت اطمینان نصیب ہوا۔ اُنھیں یقین ہو گیا کہ اب مصیبت کے دن گزر گئے کیونکہ راجپوت لوگ مہمان کے ساتھ دغا نہیں کرتے بلکہ اسے بیدینی خیال کرتے ہیں اور میرے ساتھ دھوکا نہ کرینگے۔ لیکن تجربے نے اس خیال کو غلط ثابت کر دکھایا۔ کیونکہ راجہ سیندھیا کے رزیڈنٹ کپتان کوالنس نے راجہ جگت سنگھ کو لکھا کہ" اگر وہ نواب وزیر علی خاں کو انگریزوں کے حوالے کر دیں تو انھیں سرکار کمپنی سے بہت کچھ انعام عطا ہوگا اور دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو جائیں گے" راجہ جگت سنگھ نے سیم و زر کی طمع میں پھنس کے راجپوتی دھرم فراموش کر دیا اور ۱۸۰۰ء میں نواب وزیر علی خاں کو اس شرط سے انگریزوں کے حوالے کر دیا کہ " وہ جان سے نہ مارے جائیں "

قورٹ ولیم | نواب وزیر علی خاں کلکتے کے قلعہ میں سختی سے قید کیے گئے۔ اُن کے رہنے کو ایک مختصر سی کوٹھری تجویز کی گئی جس کے چاروں طرف آہنی سلاخیں جڑی تھیں البتہ اتنی عنایت ضرور کی گئی کہ سونے کے لیے ایک پلنگ دیدیا گیا اور اس قید خانے میں یہی اس نواب کا اثاثہ تھا۔ کھانا، ہندوستانی باورچی کا پکایا ہوا دیا جاتا تھا۔ سچ تو یہ

کہ نواب نے اپنی حکمرانی کے دور میں ایسی غذا کبھی اپنے ملازمین کو بھی نہیں کھلائی تھی جو اس اسیری کے زمانے میں اُن کے واسطے تجویز کی گئی تھی۔ اُنھوں نے اس مصیبت میں پورے ۱۷ سال ۳ مہینے اور ۱۴ دن بڑی سختی اور مصیبت میں بسر کیے۔ تنہائی کے عالم میں شعر و سخن کا مشغلہ تھا اور بس ؟

شاعری | جب تمام مشغلے ترک ہو جاتے ہیں اور انسان کا قلب چوٹیں کھاتے کھاتے چور چور ہو جاتا ہے اور درد بھرے دل سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے جس کی اثر خیزیاں خدا کی پناہ! زبان سے نکلتے ہی عالم کے قلوب کو برما دیتی ہے اور دراصل اسی چیز کا نام حقیقی شاعری ہے۔ نواب وزیر علی خاں کو اپنی حکمرانی کے مختصر دور میں جو طربناک ہوا کے جھونکے کی طرح آیا اور گزر گیا۔ شاعری کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اس باب میں تاریخیں خاموش ہیں۔ اِن کے درباری شاعروں کا حال پردۂ خفا میں مستور ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ وہی لوگ ہونگے جو نواب آصف الدولہ کے دُربار دربار کی زیب و زینت تھے۔ البتہ جب تقدیر کے پانسہ نے پلٹا کھایا اور جے پور کے راجہ نے سونے چاندی کے ٹکڑوں کا لالچ کرتے ہوئے نواب وزیر علی خاں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور ناز و تنعم میں پرورش پائے ہوئے نواب کو کلکتے کے فورٹ ولیم کی تنگ و تاریک کوٹھری نصیب ہو چکی تو اس پُر حسرت و یاس زندگی میں شاعری نے ہمدمی و مونسی کا حق ادا کیا۔

جب نواب وزیر علی خاں اپنے چاروں طرف سناٹا اور تنہائی پاتے تھے اور گوروں، سولجروں یا اُس آہنی کٹھرے کے سوا جو اُن کے چاروں طرف لگا دیا گیا تھا کچھ نظر نہ آتا تھا تو گزشتہ عظمت و جلال اور عیش و طرب کی تصویریں آنکھوں میں پھرنے لگتی تھیں۔ بے اختیار دل سے دھواں اُٹھتا تھا۔ اور جذبات بے قابو کر دیتے تھے۔ اس عالم میں وہ قلم اُٹھا کر اُن مضامین کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیتے تھے۔ قید و بند کی حالت میں کسی کو نواب وزیر علی خاں سے ملنے جلنے اور گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کوٹھری میں چند تاریخی کتابیں اور ایک مگدر کی جوڑی رکھی رہتی تھی۔ یہی واحد مشغلہ تھا جو ۱۷ برس ۳ ماہ ۱۴ یوم تک مونس و دمساز رہا۔

شاگردی | شاگردی کا حال نہیں کھلتا۔ کیونکہ اسیری کے عالم میں کسی کو نواب وزیر علی خاں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ غالباً عروض اور قافیہ طالب علمی کے زمانے میں پڑھا ہوگا جو ان

دنوں نصاب میں داخل تھا۔ قید کے دنوں میں ہموم و آلام کے جذبات شاعری کے محرک ہوئے طبع سلیم نے اصلاح کی اور اودھ کا یہ بے تاج و نگین نواب شاعر بن گیا۔ ان کا سارا کلام تلف ہوگیا۔ تاریخ اودھ میں ان کی صرف ایک غزل نظر سے گزری جو عالم مصیبت کی شہادت دیتی ہے۔ تذکرہ "سخن شعرا" اور "گلشن بیخار" وغیرہ میں محض دو شعر ملتے ہیں جو نمونۃً پیش کش کیے جائیں گے۔

وفات: جب نواب وزیر علی خاں کو ۱۷ برس سے زیادہ اسیری کے جاں گداز اور روح فرسا مصائب جھیلتے گزر گئے اور سن شریف ۳۶ سال کا ہوا تو موت کو بھی اُن کی زار و زبوں حالت پر ترس آگیا۔ رفتہ رفتہ صحت بگڑی اور بعض امراض لاحق ہوئے ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج ہوا عمر کا پیمانہ بھر چکا تھا۔ کوئی معالجہ کارگر نہ ہوا۔ آخر ماہ جون ۱۸۱۷ء مطابق شعبان ۱۲۳۲ھ میں فورٹ ولیم کی اُسی کوٹھری میں انتقال کیا جو بخت واژوں کی بدولت نصیب ہوئی تھی اور جہاں صرف ایک پلنگ، چند کتابیں اور گاڑھے کی جوڑی کے سوا اثاث البیت میں کچھ نہ تھا۔ جنازے کے ساتھ لکھنؤ کے موجودہ لوگ سر و پا برہنہ شیون و شین کرتے جاتے تھے۔ کاشی بگان میں مدفن نصیب ہوا جہاں ٹیپو سلطان کے ایک لڑکے کی بھی قبر ہے۔ ابتدا میں کمپنی کی جانب سے قبر پر پہرا بیٹھا تھا۔ کوئی نمک خوار فاتحہ خوانی کو بھی نہ جا سکتا تھا پھر کچھ مدت کے بعد پہرا اٹھوا لیا گیا اور قبر پر چھوٹا سا مقبرہ تعمیر کر دیا گیا جو ہنوز مقفل رہتا ہے۔

"فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ"

مزار پر یہ کتبہ کندہ ہے:

وزیر عصر وزیر علی آصف جاہ — چو سوئے خلد بریں رفت زیں سرائے غرور
زدیم غوطہ بدریائے فکر تا آریم — بدست گوہر تاریخ مہر آں مغفور
بگوشم آمدہ ناگہ بشور و شیون و شین
نوائے وائے دریغا زجن و انس و طیور

اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جوں سبزۂ زندہ آمنہ ہیں پیروں کے تلے ہم — اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
جس گل پہ نظر کرتے ہیں، آتا ہے نظر خار — گلشن کے چلے جاتے ہیں کانٹوں میں بھرے ہم

ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے　　نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
افسوس کہ اس دل کا کنول کھلنے نہ پایا　　کوئی دن میں چلے جاتے ہیں مالی کے تلے ہم
اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہیں　　فریاد کریں کس پہ قسمت کے جلے ہم
دکھ اپنا عبث کہتے ہیں بیدرد کے آگے　　بے بس ہو جہاں آگرے ہرگز نہ ٹلے ہم

زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں
رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

دیگر

بعد رنجش کے مزہ ملنے سے کچھ حاصل نہیں　　گر تمھیں اُلفت نہیں، اپنا بھی اب وہ دل نہیں

دیگر

اُٹھ گئے محفل سے سارے یار او ڈھیل پڑی　　اے خلل انداز گردوں اب تو تجکو کل پڑی

محمد بن تومرت

اور

موحدین کا آغاز

(۴)

(از ایڈیٹر)

عبدالمومن بن علی کے متعلق بعض روایتوں میں یہ لکھا ہے کہ وہ محمد بن تومرت کو تلمسان کے قریب کے ایک گاؤں میں ملا۔ عبدالمومن اپنے چچا کے ساتھ ارض مشرق کی طرف جا رہا تھا تاکہ تحصیل علم میں مصروف ہو۔ مہدی اس نوجوان سے باتیں کرنے لگا اور کہا جو علم حاصل کرنے تم مشرق جا رہے ہو میں تم کو یہیں دے سکتا ہوں۔ اور اُس نے اس نوجوان عبدالمومن کو چند پیشین گوئیاں ایک کتاب میں لکھی ہوئی دکھا دیں جس میں حسب ذیل الفاظ تھے: "دینی اور دنیوی حکومت سوائے عبدالمومن کے اور کسی کے ذریعے سے نہ حاصل ہوگی جو مراد دین کے لیے ایک چراغ ہدایت ہوگا"۔

غرض مہدی نے عبدالمومن کو سمجھا بجھا کے اپنے ساتھ لے لیا اور اُسے اپنے مقصد کے

لیے بخوبی تیار کر لیا۔ اور شہر فاس میں آیا جو مرادو دین کا دار الحکومت تھا۔
اس شہر میں پہونچ کے یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک جمعہ کو جب کہ سب لوگ جامع مسجد میں نماز کے لیے جمع تھے محمد بن تومرت نمازیوں کی سب سے اگلی صف میں جا پہونچا اور اسی جگہ پر جا بیٹھا جو عموماً اماموں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ سب لوگوں کو اس کی اس جرأت پر بڑا تعجب ہوا اور مسجد کے ایک خادم نے اُس کے قریب آ کے کہا "یہ مقام امام المسلمین کے لیے مخصوص ہے۔ لہذا اُن کے سوا اور کوئی یہاں نہیں بیٹھ سکتا" یہ سنتے ہی محمد بن عبد اللہ اُس خادم کی طرف متوجہ ہوا اور اپنا چہرہ نہایت سنجیدہ بنا کے نرم لہجے میں جواب دیا "اِنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ" یعنے درحقیقت مسجدیں فقط خدا کی ہیں۔ اس جواب کے بعد وہ نمازیوں کی طرف متوجہ ہوا اور قرآن مجید کی وہ پوری صورت پڑھ گیا جس میں مندرجہ بالا الفاظ تھے۔ لوگ اُس کی طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں اُس کی تعریف کرتے جاتے تھے
اس کے بعد ہی بادشاہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آ پہونچا۔ عادت کے مطابق سب لوگ اُس کی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اکیلا محمد بن تومرت اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور آنکھیں اُٹھا کے بھی بادشاہ کی طرف نہیں دیکھا۔ غرض اس کی وضع اور حالت میں کوئی خفیف سا بھی فرق نہیں ہونے پایا۔ سب لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھتے رہے اور دل میں اس کی قدر کرنے لگے۔
جب نماز ختم ہو گئی تو عبد اللہ سب سے پہلے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے سلام پھیرتے ہی بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کے کہا کہ "دیکھو تم اپنی سلطنت کی خرابیوں اور ناانصافیوں کا علاج کرو کیونکہ خدا نے تم کو حاکم بنایا ہے اور وہ تم سے اُن سب قوموں کا حساب لے گا جو تمھارے سپرد کی گئی ہیں۔
شاہ علی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن جو جملہ عبد اللہ بن تومرت کی زبان سے نکلا تھا اُس نے عوام کے دلوں پر پورا اثر کیا اور اُس کا دراصل یہی مقصد بھی تھا۔ بادشاہ نے خیال کیا کہ یہ کوئی تارک الدنیا فقیر ہے جس نے رہبانیت کی زندگی اختیار کر لی ہے۔ لہذا اُس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر تمھاری کوئی ضرورت ہو تو بیان کرو تاکہ رفع کر دی جائے۔ عبد اللہ نے اسی جرأت اور لہجے میں جواب دیا کہ میری کوئی خواہش اس دنیا کی نہیں میں فقط اتنا چاہتا ہوں کہ خرابیوں کی اصلاح ہو اور لوگ راہ راست پر چلیں۔
ہم بیان کر چکے ہیں کہ مہدی کو کس طرح اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور جب اُس کا انتقال ہوا تو ایک بہت بڑا علاقہ اُسکے زیر حکومت تھا۔ عبد المومن بن علی اُس کا مشیر اور وزیر تھا۔ غالباً

محمد بن تومرت کا بھی یہ منشا تھا کہ میرے بعد وہی حاکم ہو مگر بعض لوگوں کو اس سے اختلاف تھا۔ بعض روایتوں میں ایک عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

کتاب الملوک کا مصنف عبدالمومن بن علی کے بارے میں لکھتا ہے کہ اُس نے مہدی کی موت کو تین سال تک لوگوں سے چھپائے رکھا اور خود مہدی کے نام سے حکومت کرتا رہا۔ اس اثنا میں عبدالمومن نے ایک شیر کے بچے کو پالا اور اُسے سکھایا کہ اُس سے محبت کرے اور خوشامد کا اظہار کیا کرے۔ اسی طرح ایک چڑیا بھی پالی اور اُسے چند جملے عرب اور بربر کی زبان میں رٹا دیے جس کا مطلب یہ تھا کہ عبدالمومن بن علی اس سلطنت کا حامی اور محافظ ہے۔ جب وہ اُن جانوروں کو اپنی مرضی کے مطابق بخوبی تعلیم دے چکا اور اُس نے دیکھ لیا کہ چڑیا بولنے میں اور شیر خوشامد کرنے میں کامل ہو گئے ہیں تو اُس نے تینمل کے باہر ایک مکان بنوایا اور اُس میں ایک بہت وسیع کمرہ تعمیر کرایا جس کے بیچو بیچ میں ایک ستون تھا۔ اور اُس کی چوٹی پر چڑیا کا پنجرا رکھ دیا گیا۔ اپنے شیر کے لیے بھی اُس نے ایک مناسب مقام پر مخفی کٹھرا بنوا لیا۔ اس کے بعد اُس نے حکم دیا کہ ملک کے شیوخ اور معززین موحدین وہاں جمع ہوں۔

ایک دن جبکہ وہ سب لوگ اس وسیع کمرے میں جمع تھے عبدالمومن منبر پر کھڑا ہوا جو کہ فرش سے بلند کر کے بنا دیا گیا تھا اور اُسی کے نیچے شیر کا خفیہ کٹھرا تھا۔ وزیر نے لوگوں کو مخاطب کر کے سب سے پہلے خدا کی حمد کی انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا۔ اور اُس کے بعد اپنے مرحوم حاکم مہدی کی تعریف کی اور اُس کے متعلق خدا سے دعا مانگی۔ اس کے بعد اُس نے دعا مانگی کہ خدا مجھ پر اور سب حاضرین پر اپنی رحمت نازل کرے۔ اس کے بعد اُس نے لوگوں کو اپنے سردار مہدی کے انتقال کی خبر دی اور اُنھیں صبر کی ہدایت کی۔ یہ سُن کے سب موحدین جو وہاں جمع تھے رونے لگے لیکن عبدالمومن بن علی نے کہا "تمھارا امام اب پہلے سے زیادہ اچھی حالت میں ہے اور اُس کی خواہش ہے کہ تم میں کسی قسم کا اختلاف یا نااتفاقی نہ پیدا ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے نفس کے بندے نہ بن جائیں اور ذاتی فائدے نہ ڈھونڈھیں بلکہ سچے موحدین کی طرح آپس میں مشورہ کر کے ایک خلیفہ کو اپنا امیر منتخب کر لیں جو ہماری حفاظت اور ہم پر حکمرانی کرے تاکہ دشمن ہماری سلطنت کو تباہ و برباد نہ کر سکیں۔"

اتنا کہہ کے وہ خاموش ہو گیا۔ شیوخ اور دیگر معززین جو کہ موجود تھے وہ بھی خاموش تھے۔ کیونکہ وہ اپنے دلوں میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اتنے میں چڑیا نے صاف آواز میں چلا کے کہا "اپنے امیر المومنین خلیفہ عبدالمومن بن علی کی عزت کرو کیونکہ وہ فاتح اور اقبالمند ہے۔ وہی سلطنت کا محافظ اور معاون ہے۔"

ساتھ ہی عبدالمومن نے شیر کے کٹہرے کا دروازہ خفیہ طریقے سے کھول دیا۔ فوراً وہ وحشی درندہ کٹہرے میں نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی سب خوف زدہ ہو گئے۔ شیر نے دانت نکالے اور دم ہلانے لگا اور اُس کی آنکھیں آگ کی طرح چمکنے لگیں۔ لوگ خوف زدہ ہو کے بھاگ گئے ہوتے مگر کسی میں حرکت کرنے کی بھی قوت نہیں باقی تھی۔ یہ دیکھ کر عبدالمومن نہایت متانت کے ساتھ آگے بڑھا اور شیر کے قریب آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی شیر کی حالت بدل گئی اور اب وہ بالکل مطیع اور فرمانبردار تھا کیونکہ اُسے ایسی ہی تعلیم دی گئی تھی۔ چند لمحوں میں وہ وحشی درندہ آہستہ سے آگے بڑھا اور اپنے مالک کا ہاتھ چاٹنے لگا۔

موحدین نے اس عظیم الشان کارنامے کو دیکھتے ہی عبدالمومن بن علی کو یک زبان ہو کر اپنا خلیفہ منتخب کر لیا اور کہا کہ ہمیں خدا کے حکم اور اپنے امام المہدی کے منشا کے لیے اب اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ لہذا اُسی دن اُنھوں نے اپنے نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اب وہ شیر ہر وقت عبدالمومن بن علی کے ساتھ رہتا اور جہاں کہیں جاتا وہ بھی ساتھ جاتا۔ اسی قدر نہیں بلکہ مسجد میں بھی وہ جانور اپنے آقا کے ساتھ ہوتا۔

اس طرح اس شیر نے اس شہزادے کے عروج حاصل کرنے میں مدد دی جس نے بعد کے زمانے میں اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ ان واقعات کو ابی علی الانس نے نظم کیا ہے اور وہ کہتا ہے: (۱) خونخوار شیر نے جس کی ایال بہت بڑی تھی تیرے تخت پر بیٹھنے میں مدد کی۔ (۲) چڑیاں انسانی آواز میں تیری تعریف کرتی ہیں اور تجھے خلیفہ منتخب کرتی ہیں۔ (۳) لہذا یہ جائز ہے کہ تو اپنا لقب امیر بامر اللہ رکھے۔

عبدالمومن بن علی کے ہاتھ پر تینوں اعلیٰ مجلسوں نے بیعت کی۔ سب سے پہلے پچاس موحدی شیوخ نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد اور سب لوگوں نے اُن کی تقلید کی۔ یہ رسم نہایت مبارک شگونوں کے ساتھ ادا ہوئی اور اُسی دن سے مراودین کے اقبال کا ستارہ جو اتنے دنوں سے چمک رہا تھا دھندلا پڑ گیا۔ اور اسی وقت سے قسمت نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ عبدالمومن بن علی نے اُنھیں نمایاں شکستیں دے دیں اور اُن کے علاقوں کا [illegible] گیا۔ عبدالمومن نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ سارے علاقہ المغرب اور افریقیہ کو فتح کر لیا۔ سارا اسپین کا علاقہ بھی اس کی حکومت میں شامل ہو گیا۔

—•—



۷۹۶

من آنم کہ من دانم

یعنے

مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کی خود نوشت سوانحعمری

آپ بیتی

مناظرہ

ٹیابرج سے تقریبا ایک میل کے فاصلے پر غیر مقلد اہل حدیث کی ایک بنگالی جماعت رہتی ہے جس میں زیادہ تر جاہل درزی ہیں۔ ان ہی میں سے منیر الدین نام ایک درزی ہمارے کپڑے سینے کو آیا کرتا، اور مجھے ایک سنی مسلمان طالب علم سمجھ کر مجھ سے زیادہ ملتا۔ اور اپنے عقائد مناظرے کی شان سے میرے سامنے پیش کیا کرتا۔ میں اُس وقت تک علم حدیث سے بالکل ناآشنا تھا۔ معقولی توجیہوں اور قیاسی خیال آرائیوں سے اُس کی تردید تو کر دیا کرتا مگر خود اپنے دل کو اطمینان نہ ہوتا

ایک دن اُس نے کہا چلیے ہم آپ کو اپنے مولوی صاحب سے ملائیں۔ میں بے تکلف چلا گیا تو دیکھا ایک پنجابی مولوی صاحب جو طویل القامت نوجوان ہیں اُن لوگوں کی مسجد میں رہتے ہیں اور اُن کے مقتدا بنے ہوئے ہیں۔ ان کا نام ابو تراب محمد رحیم بخش محمدی تھا اور بلا مبالغہ ڈیڑھ دو انچ کی لمبی چوڑی مُہر فتوؤں پر ثبت کیا کرتے تھے۔ ایک بنگالی نے اپنی لڑکی بھی اُن کے نکاح میں دیدی ہے میں نے اندازہ کیا تو نظر آیا کہ ان مولوی صاحب اور دیگر جہلا میں بہت ہی تھوڑا فرق ہے۔ دکھانے کے لیے بہت بڑی بڑی ضخیم کتابیں عینی اور فتح القدیر اور صحاح ستہ وغیرہ ہر وقت پیش نظر رکھتے ہیں لیکن پڑھوایئے تو ایک سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے

اس جہالت پر بھی حنفیوں اور اہل حدیث کے مابہ النزاع مسائل اور ان کی متعلق حدیثیں اور اقوال محدثین سلف ایسے ازبر ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی بمشکل ان سے بحث کر سکتا ہے۔ میں نے ایسی باتیں کیں کہ وہ خوش ہو گئے اور ان سے میرا ربط ضبط زیادہ بڑھ گیا۔

چند ہی روز بعد ایک دن منیر الدین نے مجھ سے آکر کہا کہ ہمارے یہاں ایک مناظرہ ہونے والا ہے۔ ہم آپ کو بھی لے چلیں گے۔ اور میں نے اس کو خوشی سے قبول کر لیا۔ دو ہی چار روز بعد وہ مناظرے کا دن آگیا اور میں اس کے ساتھ مولوی رحیم بخش کے پاس گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مناظرہ وہاں سے تین چار میل کی مسافت پر کسی اور جگہ ہوگا۔ ہم مولوی رحیم بخش کے ساتھ وہاں گئے۔ پندرہ بیس من وزن کی کتابیں چھکڑوں پر لاد کے وہاں پہلے سے بھیج دی گئیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک بنگلیوں کا اونچا چھپر ہے جس کے درمیان میں بے ترتیبی سے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ گرد بہت سے اہلحدیث بنگالی بیٹھے ہوئے ہیں تین غیر مقلد عالم باہر سے آئے ہیں جن میں ایک نابینا ہیں اور سب سے زیادہ قابل وہ حدیث و قرآن کے حافظ وہی ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہاں سے دو تین سو گز کے فاصلے پر ایسا ہی ایک اور چھپر ہے اور وہیں حنفیوں کا مجمع ہے اور کلکتے کے ایک مشہور عالم مولوی شریعت اللہ صاحب مناظرے کو آئے ہیں۔ پہلے دونوں مکان والوں نے اپنے اپنے فریق کی دعوت کی اور بارہ بجے کے قریب مناظرے کی تحریک شروع ہوئی۔ اہل حدیث چاہتے تھے کہ حنفی یہاں آئیں اور حنفی چاہتے تھے کہ اہل حدیث وہاں جائیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ردوبدل میں ان میں سے کوئی بات طے نہ ہوئی۔ اور آخر قرار یہ پایا کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ سے چلیں اور اس جگہ پر جہاں سے دونوں چھپر یکساں فاصلے پر ہوں مناظرہ ہو۔ اس قرارداد کے مطابق دونوں گروہ چلے اور جب سامنا ہوا تو دونوں نے بیچ میں تھوڑا سا فصل چھوڑ کے اپنے اپنے فرش بچھائے۔ مولوی شریعت اللہ صاحب حنفیوں کے آگے بیٹھ گئے اور ان کے ہاتھ میں مشکوٰۃ تھی۔ ان کے سامنے اہل حدیث کی طرف بڑی بڑی ضخیم کتابوں کا ایک پہاڑ قائم کر دیا گیا تو ان پر ایک عجیب

خوفناک اثر پڑا۔

اب ظہر کا وقت آگیا اور میں نے یہ عبرت ناک تماشا دیکھا کہ دونوں گروہوں نے الگ الگ جماعت سے اپنے اپنے فرش پر نماز پڑھی۔ مناظرہ شروع ہونے سے پیشتر میں کاتب مناظرہ بنا کے دونوں گروہوں کے بیچ میں بٹھا دیا گیا۔ اب مولوی شریعت اللہ صاحب کھڑے ہوئے اور مشکوٰۃ کھول کر حدیث خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم پڑھی۔ اور گھبراہٹ میں رواہ مُسلِم کی جگہ رواہ مُسلَم کہہ گئے اہل حدیث نے اس کا مضحکہ اڑایا اور بتایا کہ رواہُ مُسلِمؒ کہیئے۔ اس اصلاح نے مولوی شریعت اللہ پر اور خراب اثر ڈالا اور جو تقریر کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے بلکہ اتنا ہی کہہ کے خاموش ہو گئے کہ "امام ابو حنیفہؒ تابعی ہیں لہذا قرن ثانی میں ہیں"۔ اس کے جواب میں اہل حدیث کی طرف سے اندھے حافظ جی نے کہا کہ۔ "امام صاحب تو قرن ثانی کیسا قرن خامس میں تھے" یہ سن کر میں بھی حیران ہوا کہ امام صاحب کے تبع تابعی یعنی قرن ثالث میں ہونے کے بارے میں تو کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ساتھ ہی اُن حافظ جی کے اشارے سے ایک دوسرے عالم اہل حدیث نے شاہ ولی اللہ صاحب کی ازالۃ الخفا کھول کر یہ عبارت دکھا دی کہ "امام ابو حنیفہ در قرن خامس بود" اس پر مولوی شریعت اللہ صاحب سے تو کچھ کہتے نہ بن پڑا اگر میں نے جرأت کر کے کتاب مانگی کہ دیکھوں شاہ صاحب نے کیا لکھا ہے۔ مگر انھوں نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور کہا آپ سے کیا تعلق۔ آپ کوئی فریق مناظرہ نہیں ہیں۔ بس اسی کارروائی پر مناظرہ ختم ہو گیا۔

اہل حدیث نے خوشی کے نعرے بلند کرنا شروع کیے اور حنفی اپنی ناکامی پر نہایت پریشان ہوئے۔ چنانچہ حنفیوں کی طرف سے مولوی عبدالحلیم نام ایک بنگالی طالب علم جو مجھ سے ہدیۂ سعیدیہ پڑھتے تھے جوش میں بھرے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے اگر آپ مدد دینے کا وعدہ کریں تو میں ان لوگوں سے تحریری مناظرے کا وعدہ لے لوں۔ میں نے کہا ضرور وعدہ لے لیجیے۔ اور انھوں نے فوراً مولوی رحیم بخش کے پاس جا کر کہا کہ اگر آپ کو دعویٰ ہے تو مجھ سے تحریری مناظرہ کیجیے اور انھوں نے قبول کر لیا۔ بس اس کے بعد ہم سب اس رزمگاہ سے اپنے گھروں کو واپس آئے۔

تین چار روز بعد مولوی عبدالحکیم میرے پاس مولوی رحیم بخش کی ایک تحریر لیے ہوئے آئے جو عربی میں تھی اور اُس میں لکھا تھا "اے عبدالحکیم اگر تو اپنے باپ کے نطفے سے ہے تو نماز میں مردوں کا ناف کے نیچے اور عورتوں کا سینے کے اوپر ہاتھ باندھنا ثابت کر دے" جواب لکھنے کا بار میرے سر تھا اور میں حدیث سے نا آشنائے محض تھا۔ ہاں ادب میں تھوڑی بہت قابلیت رکھتا تھا اس لیے کہ قلیوبی اور نفحۃ الیمن والد سے اور دیوان متنبی اور مقامات حریری ایک شیعہ عالم مولوی محمد حیدر صاحب سے پڑھ چکا تھا۔ اس تحریر کی عربی عبارت ویسی ہی تھی جیسی عبارت کی مولوی رحیم بخش صاحب سے اُمید کی جا سکتی تھی۔ اس لیے کہ کوئی جملہ نہ تھا جس میں چھ سات غلطیاں نہ ہوں۔ مگر نفس مسئلے کے جواب کے لیے کتب حدیث کے مطالعے کی ضرورت تھی۔ میں قبلہ و کعبہ میرزا محمد تقی کے یہاں سے بخاری اور مسلم مع نووی کے لے آیا اور اُن کا مطالعہ شروع کیا۔ ساتھ ہی مولوی عبدالحکیم نے مجھے مدرسہ فتح پوری دہلی کے ایک مدرس مولوی محمد شاہ کی ایک کتاب لا دی جس میں فقہ حنفیہ کے چند مختلف فیہ مسائل حدیثوں سے ثابت کیے گئے ہیں۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ مولوی محمد شاہ کو اس مسئلے کے ثابت کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی اور بخاری اور مسلم میں تو کوئی ایسی حدیث نہ نظر آئی جس کو پیش کر کے مولوی رحیم بخش کی تردید کی جا سکے۔

مگر جواب لکھنا ضرور تھا۔ چنانچہ تردید میں میں نے عربی میں ایک رسالہ لکھ دیا۔ جس میں سینکڑوں ادبی غلطیاں بتائیں۔ اور نفس مسئلے میں محض قیاسی اجتہاد سے کام لیا۔ مولوی رحیم بخش صاحب تو اپنی بے انتہا غلطیوں کی وجہ سے پھر کوئی جواب نہ دے سکے۔ فقط زبانی کہلا بھیجا کہ آپ نے کوئی حدیث نہیں پیش کی۔ اور مولوی عبدالحکیم اپنی جگہ پر بہت خوش ہوئے کہ بالا میرے ہاتھ رہا۔ مگر میری حالت یہ ہوئی کہ بخاری اور مسلم کا مطالعہ شروع کیا اور جس قدر زیادہ پڑھا اُسی قدر زیادہ نظر آتا گیا کہ حدیثیں ہمارے مسلک حنفیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ چنانچہ اسی وقت سے آمین و رفع یدین کو شروع کر دیا جس کو والد نے تو زیادہ اہمیت نہیں دی مگر تمام احباب مخالف ہو گئے۔ لیکن ان کی مخالفت ہمیشہ مذاق اور دل لگی کی باتوں میں ٹل جایا کی۔

———•۱۵۱•———

معیار زبان اُردو

(از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

زبان کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اُس کے بقا کی کوشش کی جائے۔ اُس کو علمی زبان بنایا جائے اور اُس کا تحفظ کیا جائے۔ ہندوستان کی قدیم مادری زبان سنسکرت تھی۔ زمانے کی ضرورت اور نئی ایجادوں نے اُس میں ترمیم اور تحریف شروع کی اور دوسری زبان کے الفاظ ملانا شروع کیے تو پنڈتوں نے ان جدید الفاظ سے پرہیز اختیار کیا اور اپنی سنسکرت کو ان الفاظ سے پاک رکھنا چاہا۔ مگر "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" جب روزمرہ کاروباری ضرورت کو سنسکرت پورا نہ کرسکی تو لوگوں نے اپنی ضرورت اور اپنے لہجہ کے موافق اور لفظ بھی شامل کرلیے اور شامل کیا کیے مجبوراً اُن کو جدید الفاظ بولنا پڑے سنسکرت کے بعض لفظوں کو توڑ مروڑ کے اپنے لہجہ کے موافق بنایا۔ پنڈتوں نے اس بازاری زبان کا نام بھاکا رکھا۔ اب سنسکرت تو پنڈتوں کے طبقہ میں صحیح رہ گئی اور بھاکا تمام ہندوستان کی زبان قرار پائی۔ اس بھاکا کی ابتدا برج یعنی متھرا سے شروع ہوئی۔ اور اس زبان میں مذہبی کتابیں مثل رامائن اور برج بلاس کے ترجمہ ہوکر بہت مقبول ہوئیں۔ پھر وہی بھاکا زبان شاہانِ ہند کے قیام ہند میں اپنا لہجہ بدلنے لگی۔ اس میں چند حروف فارسی اور عربی کے گھل مل گئے یعنے ژ، ص، ض، ط، ظ، غ، ش، خ، ق۔ رسم الخط بجائے ہندی حرفوں کے فارسی قرار پایا اور یہ ایسا مقبول ہوا کہ ہندو مسلمان دونوں بولنے اور لکھنے لگے۔ چونکہ یہ نئی ترمیم لشکریوں کی باہم گفتگو سے زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ لہذا اس کا نام لوگوں نے اُردو رکھ لیا۔ اور یہ تمام ہندوستان میں ہر جگہ بولی جانے لگی دہلی اس زبان کا دارالخلافت قرار پایا اور اختلاف میں اسی کی سند قابل قبول مانی گئی۔ دہلی کے بادشاہوں نے اس خیال سے کہ یہ بازاری زبان کام کی ہے اس کے روزمرہ اور اصطلاحات کا تحفظ کیا۔ اور صرف و نحو کی بنیاد قائم کی پھر اس زبان کے شاعر پیدا ہوئے تو اُن کو اپنے دربار میں جگہ دی اور اُن کی

ہمت افزائی کی۔ دہلی میں گھر گھر مشاعرے ہونے لگے۔ اور یہ شہر اُردو زبان کا اصلی مرکز بن گیا۔ برسوں کی خدمت کے بعد اُردو زبان تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔

اب زمانے نے ایک اور پلٹا کھایا۔ شاہ عالم بادشاہِ دہلی جن کے سایۂ عاطفت میں یہ زبان پل رہی تھی زمانے کی گردش سے گرفتار بلا ہوئے۔ اُن کی آنکھیں دشمنوں نے نکال لیں۔ شہزادوں کو سخت قید میں رکھا۔ دہلی مٹی اور برباد ہوئی۔ کوئی کسی کا پوچھنے والا نہ رہا۔ عسرت اور فاقہ کشی سے بڑے بڑے صابروں کے قدم اُکھڑ گئے۔ لوگ دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔

دہلی کے شہزادے قید شدید سے رہا ہوئے۔ مرزا جواں بخت اور شہزادۂ دارا شکوہ اور تمام بادشاہ کے عزیز و اقارب، وزرا، امرا، شاعر، نواب زادے غربت نصیب ہوئے۔

اس زمانے میں صوبۂ اودھ کی فیاضیوں کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر دولت کا مینھ برسا رہے تھے۔ اور علم و ہنر کے سچے قدردان تھے۔ شہزادوں نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ نواب آصف الدولہ نے چار چار پانچ پانچ ہزار کی تنخواہیں سب کی مقرر کیں۔ یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی تو اُردو کے سرمایۂ ناز شعرا نے بھی لکھنؤ کا رُخ کیا۔ ملک الشعرا میر تقی میر، مرزا رفیع السودا جن کے ڈنکے دہلی میں بجے ہوئے تھے عازمِ لکھنؤ ہوئے، اُن کے پیچھے پیچھے سارے دہلی کے شاعر سیدھا مُنھ اُٹھائے ہوئے لکھنؤ چلے آئے۔ میر حسن حسن، میر ضاحک، میر تقی ترقی، میر سوز، مرزا جعفر زٹلی، صاحبقراں، شاہ حاتم حسرت، جرأت، مصحفی۔ دہلی کے صناع۔ پیشہ ور۔ باورچی سبھی تو لکھنؤ میں جمع ہو گئے۔ اب جدھر دیکھیے دہلی کے مایۂ ناز امرا، شرفا، شہزادے، نواب زادے دہلی کے شاعر سب لکھنؤ کی گلیوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ذات سے لکھنؤ دہلی ہو گیا۔ آخر یہ شہر اُردو کا محک امتحان قرار پایا۔

دہلی کی تقلید اُردو کے بارے میں اطراف پنجاب میں ہونے لگی۔ یہ خدمت شعرا کے متعلق تھی۔ اُستاد اپنے اپنے شاگردوں کو اصولِ زبان، محاوریت روزمرہ

اصطلاحات کی تعلیم دیتے تھے۔ شاگرد اپنے اُستاد کی تقلید سے قدم باہر نہ رکھتے تھے۔

لکھنؤ کی تقلید میں ہندوستان کا طبقہ اعظم تھا۔ پورب، اُتر، دکھن میں اکثر مقلد لکھنؤ کے شاعر زبان سکھانے پر مامور تھے اور انھیں شعرا کی تقلید تمام تشار اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے اُستاد کی تقلید میں متروکات قائم کرتا تھا اور اس طرح زبان مانجی جاتی تھی۔ اس تقلید سے یہ فائدہ ہوا کہ بہت جلد تمام ہندوستان میں یہ زبان پھیل گئی۔

ولایتِ فرانس اور انگلینڈ سے جتنے انگریز ہندوستان میں آتے تھے اُن کے لیے کلکتہ میں ایک درس گاہ قائم کی گئی تھی۔ سب سے پہلے اُن کو اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اُن کے لیے آسان کتابیں اُردو میں لکھوائی گئیں اور گورنمنٹ نے تمام سرکاری اسکولوں میں اُردو داخل کی اس سبب سے اُردو نے بہت ترقی کی۔

اب کچھ دنوں سے لوگوں نے یہ بات تراشی کہ ہندوؤں کے لیے اُردو غیر ضروری ہے اس لیے کہ یہ مسلمانوں کی بنائی ہوئی زبان ہے۔ ہم کو ہندی حرفوں میں کتاب لکھ کر پڑھنی چاہیے اور ہندی کے مردہ الفاظ بولنا چاہیے۔ جس کے سمجھنے سے مسلمان قاصر رہیں۔ چنانچہ اس خیال کو صوبۂ اودھ میں جامہ پہنایا گیا اور اسکولی کتابیں ہندوؤں کے لیے ہندی میں چھپنے لگیں۔ اس سے مسلمانوں کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ ہندی بغیر اُردو فارسی الفاظ کے اب نہیں چل سکتی جس کا اقبال کچھ دنوں بعد ہندوؤں کو کرنا پڑیگا۔ اور دوسرے یہ بمقابلہ اُردو خط کے ہندی خط لکھنے اور پڑھنے میں دیر ہوتی ہے اس لیے تعلیم میں نقصان ہوگا۔ ہم نے سُنا ہے کہ بعض بعض جگہ اُستاد بھی اپنے شاگردوں کو مجبور کرتے ہیں کہ ہندی حرفوں کی کتابیں پڑھا کرو یہ کسی قدر زیادتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اُردو کے سمجھنے والے اور بولنے والے تو دُنیا کے ہر حصے میں ملجاتے ہیں۔ مروجہ حال ہندی کے سمجھنے والے خود صوبہ اودھ

میں بھی بہت قلیل ہیں پھر اسکی تحصیل سے حاصل - اُردو کے متعلق ایک غلط فہمی حال میں اور بھی ایجاد کی گئی ہے - اور یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شاعری وہبی ہے - سکھانے سے شاعر نہیں بنتا اور شاعر کو استاد کی ضرورت نہیں - اس خیال نے فن شریف شعر کی تو جو مٹی پلید کرنا تھی کی - یعنی شعرا ناموزوں طبع ہونے لگے اور مہمل شعر کہنے لگے - لیکن اس کے ساتھ ہی زبان اُردو کو بھی بہت نقصان پہونچنے لگا لوگ غلط محاورے لکھنے لگے - کوئی کچھ بولنے لگا کوئی کچھ -

ہندوستان کے خمیر میں یہ بات ہے کہ یہاں کے لوگ انگریزی زبان سیکھنے کے بعد زبان کے قیود کے متحمل نہیں رہے اور اپنے مرکز سے ہٹنے لگے اس لیے اُن کی زبانیں ہر شہر اور ہر قصبہ کی جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں اور ایک شہر کی زبان دوسرے شہر کی زبان سے تفاوت رکھتی ہے - رفتہ رفتہ یہی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں ایک دن بڑا تفاوت پیدا کر دیں گی - حال کی مردم شماری میں ہندوستان کی زبانیں تخمیناً تین سو لکھوائی گئی ہیں - اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی جہالت کا ثمرہ ہے جسے وہ بھگت رہے ہیں -

اُردو زبان کی جو خدمت اگلے بادشاہوں نے اگلے شعرا اور گورنمنٹ نے کی ہے اُس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اُردو بہت جلد ایک علمی زبان بن جائے - اور اس کے متروکات زبان سے خارج ہو جائیں - لیکن حال میں ایک بہت بڑا نقص یہ واقع ہوا ہے کہ حال کے شعرا بغیر تحقیق محاورہ اپنی طبیعت سے خلاف فصحا ایک اصطلاح قائم کر کے نظم و نثر میں لکھ جاتے ہیں - جس کی مغائرت اور غرابت اس بات کی مقتضی ہے کہ ان کی زبان تھوڑے زمانے کے بعد ایک جداگانہ زبان بن جائے گی - جو مخصوص انھیں کے شہر میں بولی جاتی ہوگی اور جس کو دوسرے شہر کا آدمی سمجھنے اور بولنے سے قاصر ہوگا - اور اسی طرح ہر شہر کے لیے نئے محاورے اور نئی زبان ہوگی اور ایک آدمی دوسرے آدمی کی بولی نہ سمجھے گا

اس ضرورت نے مجھے مجبور کیا کہ شعرا کو (جن کی زبان مستند ہوتی ہے) ایک مرکز کی تقلید پر آمادہ کر دوں اور اس نامعلوم غلطی سے جو ان کی زبان میں

پیدا ہو رہی ہے آگاہ کروں کیونکہ جب تک زبان کا ایک مرکز نہ ہوگا زبان ہرگز ایک نہ ہوگی - جس محاورہ کو شعرا بزعم خود لکھنؤ، دہلی کی زبان سمجھ کر نظم کر جاتے ہیں اور وہ محاورے ٹکسال باہر ہیں اُن کا اظہار نہ کیا جائے تو بھی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں ایک وقت میں زبان کو بہت بڑا نقصان پہونچائیں گی لہٰذا ہم فی الحال محاورات کی غلطی کو مع مثال سمجھاتے ہیں - ع

دہانِ زخم نے پانی جُرا کے چر کے لیے

چر کے لینا محاورہ نہیں ہے چر کے کھانا بولتے ہیں،

شادؔ عظیم آبادی ؎ شادؔ پینسٹھ برس اِس عُمر کے گذرے آخر

طرز یاران حقیقت نہ فراموش رہا

ایسے محل پہ فراموش رہنا، بولنا خلاف محاورہ ہے - فراموش ہوا بولنا چاہیئے -

ع - بس اب اُن کے ہاتھوں ہے عزت ہماری

ہاتھ جب قابو اور اختیار کے معنی پر مستعمل ہوتا ہے تو مفرد بولتے ہیں جیسے تمہارے ہاتھ آبرو ہے،

داغؔ، داورِ حشر ترے ہاتھ ہے عزت میری

میر نفیسؔ، عزت مری بہنوں کی ترے ہاتھ ہے یا رب

دبیرؔ، پروردگار شرم مری تیرے ہاتھ ہے

امانتؔ، عزت مری ہے عشقِ بُتاں میں خدا کے ہاتھ

سپہرؔ، اُٹھنا ہمارا خاک سے اب ہے خدا کے ہاتھ

امیرؔ، آئندہ آن بان ہے اپنی خدا کے ہاتھ

اور جب سبب اور وسیلہ کے معنے پر مستعمل ہوتا ہے تو جمع بولتے ہیں جیسے محلے والوں کے ہاتھوں ناک میں دم ہے - مصحفیؔ ؎

مبتلا ہم رہے نثار رہے دل کے ہاتھوں ذلیل و خوار رہے

نالۂ شور و فغاں بلبل کے لب پہ رکھدیا

چُپکے چُپکے مسکرانا گل کے اندر رکھدیا

مسکرانا رکھ دینا محاورہ نہیں ہے مسکرانا بتا دینا بولتے ہیں۔

غنچے تجھے تیری دلفگاری کی قسم — بلبل تجھے تیری آہ و زاری کی قسم
کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی — بیتاب ہے دل جناب باری کی قسم

اس میں "تجھے تیری" ترکیب غلط ہے اس لیے کہ دونوں ضمیریں ایک طرح کی ایک ساتھ بولنا غیر فصیح ہے۔ ایسے موقع پر تجھے اپنی بولنا چاہیئے۔

ولی محمد نظیر

(از مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

ولادت محمد شاہ رنگیلے کے رنگین دور میں اس بینظیر شاعر (نظیر) نے جنم لیا تھا۔ پیدائش کے سال کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا دشوار ہے کیونکہ اب تک جتنے تذکرے دیکھنے میں آئے ہیں۔ ولادت کا سنہ بتانے میں اُن سب کی زبانیں خاموش ہیں۔ لیکن چھان بین کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نادر شاہ کے حملے اور دہلی کے قتل عام کے وقت نظیر کی عمر دو یا تین برس کی تھی۔ ان کے باپ محمد فاروق سفید پوشش شریف اور ملازمت پیشہ تھے۔ جب تک دہلی میں آب و دانہ رہا وہاں مقیم رہے پھر روزگار کے سلسلے میں عظیم آباد چلے گئے اور وہیں عمر تیر کر دی۔ لیکن اہل و عیال کو دہلی ہی میں رکھا۔ کبھی کبھی رخصت لے کے دہلی آتے تھے اور بال بچوں کو دیکھ کے واپس چلے جاتے تھے۔

تعلیم و تربیت اُن دنوں تعلیم کا یہ ڈھنگ نہ تھا جو آجکل ہے۔ بلکہ زمانے کی ضرورت نے بہت کچھ تغیر اور تبدل کر دیا ہے۔ چنانچہ نظیر کی تعلیم اگلے طریقہ پر ہوئی تھی۔ محمد فاروق کچھ زیادہ فارغ البال نہ تھے مگر ان کی سسرال خوش حال تھی جس سے نظیر کا بچپن بڑے آرام سے گزرا۔ کھیل کود کا زمانہ آیا تو مٹی کے کھلونے جلیس اور میلے ٹھیلے تفریح گاہ بنے۔ اُس عہد میں ان چیزوں کی کمی نہ تھی کوئی ہندو مسلم تیوہار اس التزام سے خالی نہ جاتا تھا۔ کھیل کود کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی شروع ہوئی۔ پہلے قرآن شریف، اس کے بعد ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر فارسی سے فارغ التحصیل

ہو کے تھوڑی بہت عربی حاصل کی۔ طبیعت اس بلا کی پائی تھی جو عجز سے ہمیشہ ناآشنا رہی۔ اُنھوں نے جن زبانوں میں طبع آزائی کی ہے وہ سات سے زیادہ ہیں۔

حلیہ شریف | جوانی کی تصویر کشی تو قریب محال ہے لیکن سُنی سنائی صورت کا خاکہ یہ ہے۔ رنگ گندمی۔ قد میانہ۔ گٹھے ہوئے ہاتھ پاؤں، سینہ کشادہ، سر گول، کھوپری کے بال اُڑے ہوئے، کتابی چہرہ، چوڑی پیشانی، اُس کی شکنوں سے غور و فکر ہویدا کشیدہ ابرو، بھوؤں کے بیچ میں مسّا، مچھولی آنکھیں، ستواں ناک، ہونٹ موٹے نہ پتلے، گھنی مونچھیں، خشخشی داڑھی۔

اخلاق وعادات | نظیر کا اخلاق بہت وسیع تھا۔ وہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں مرنجان مرنجاں کے زریں مقولے پر عمل کرتے رہے۔ اُن کا برتاؤ خورد و کلاں کے ساتھ مساوی رہا۔ ایک دفعہ جس سے یاد اللہ ہو گئی ہمیشہ میل و محبت سے نباہ دی۔ ہر ایک سے خلوص، ہر ایک سے ہمدردی شعار رہا۔ مزاج میں شگفتگی کا عنصر بیش از بیش تھا۔ بات بات میں ظرافت کی شیرینی پیدا کر کے روتوں کو ہنسانا معمولی شعبدہ تھا جس صحبت میں جا بیٹھے اُسے بذلہ سنجیوں سے صحن گلزار بنا دیا۔ یہ عادت اُن کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی شباب سے شیب تک ہنسنا ہنسانا نہ چھوٹا۔ وہ بچّوں کے ساتھ بچّہ۔ جوانوں کے ساتھ جوان۔ اور بوڑھوں کے ساتھ بوڑھا بن جانے میں ایسا کمال رکھتے تھے جو اُن کے ساتھیوں کو عمر بھر نصیب نہ ہوا۔ اُن کی طینت میں شر و فساد کا شائبہ تک نہ تھا۔ عام فائدوں کو ذاتی منفعت پر ہمیشہ ترجیح دیتے رہے۔ انھیں اوصاف حسنہ کی بدولت وہ ہر گروہ اور ہر ملت میں مقبول و ہر دلعزیز تھے۔ جدھر نکل جاتے تھے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ وہ قدرتی مناظر اور میلوں ٹھیلوں کے بڑے شائقین تھے جس کے بیان سے اُن کا سارا کلام بھرا پڑا ہے۔

وضع اور لباس | نظیر کی وضع اور لباس وہی تھا جسے اگلے شرفا استعمال کرتے تھے۔ اُس لباس میں تکلف کم اور سادگی زیادہ تھی۔ سر پر محمد شاہی ٹھنچے دار گرمی۔ جسم پر گزی یا گاڑھے کا انگرکھا۔ نیچی چولی اور سیدھا پردہ۔ گلے میں لپٹا ہوا دوپٹہ پڑا رہتا تھا۔ کندھے پر لٹکا رومال۔ برکا ڈھیلا ڈھالا پائجامہ۔ جب ذرا تکلف منظور ہوتا تو گھیتلا جوتا ورنہ زرد چمڑے کی چپڑواں جوتی۔ ہاتھ میں آڑو کی جریب انگلیوں

نگینوں عقیق اور فیروزے کی کئی کئی انگوٹھیاں - یہ عام وضع تھی - جاڑوں میں اس لباس پر تیمیشٹ کا لبادہ بڑھ جاتا تھا -

مذہب - نظیر امامیہ مذہب (شیعہ) کے پیرو، اور حضرات اہلبیت علیہم السلام سے دلی عقیدت و اخلاص رکھتے تھے - محرم میں تعزیہ داری کرتے - اور ایک مہینا بیس دن امام مظلوم کے غم میں سوگ نشین رہتے تھے - اُن کے کلیات میں متعدد نظمیں موجود ہیں جن میں حمد و نعت اور معجزات کا بیان کمال جوش عقیدت سے پایا جاتا ہے - اُن کی ذات میں دینی یا قومی تعصب کی جھلک تک نہ تھی - ہر مذہب کے پیشوا کا احترام اُن کا فرض عین تھا - اُنھوں نے نظموں میں اگر اپنے مذہبی عقائد کا اعلان کیا ہے تو سُنیوں اور ہندوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اُسی جذبے اور جوش و خروش کے ساتھ اُن کے پیشواؤں اور صوفیاے کرام کے حالات منظوم کرکے رواداری کا ثبوت پیش کیا ہے - وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے - لیکن عید، بقرعید کی نماز امامیہ طریقہ سے مکان ہی پر ادا کرتے تھے - مزاج میں درویشی بیش از بیش تھی - فقیروں کی صحبت کے بہت شائق رہتے تھے - یہی سبب تھا کہ جب اُنھوں نے وفات پائی تو ہندو مسلمانوں نے برابر کا رنج کیا اور اپنے اپنے عقائد اور اُصول کے مطابق اُن کے حق میں دعاے خیر کی -

نوجوانی - نظیر کا بچپن رخصت ہونے کے بعد شباب کا پُر بہار زمانہ آ گیا - سبزہ آغاز ہوا، مسیں بھیگیں، دہلی میں بڑی فراغت سے بسر ہو رہی تھی - ایکا ایکی زمانے نے کروٹ بدلی - نادر شاہ کی خونریزی کو اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں گذرا تھا گھر بار لُٹنے اور عزیز و اقارب کے قتل ہونے سے دہلی والوں کے دلوں پر جو زخم لگے تھے وہ ابھی تک بھرنے نہ پائے تھے کہ نادر شاہ کے جانشین کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا - سہمے ہوئے قلوب اور زیادہ سہم گئے - اہل شہر کو بھاگنے اور جان بچانے کی فکر لاحق ہوئی - باشندوں نے ہجرت پر کمر باندھی - آہستہ آہستہ دہلی خالی ہونا شروع ہوئی - انھیں مہاجرین میں نظیر کا خاندان بھی شامل تھا - جس نے آگرہ کو جاے پناہ سمجھ کر اُدھر کا رُخ کیا - نظیر قافلہ سالار بنے - بوڑھی نانی، دکھیا ماں اور دو تین لونڈی غلام فقط قافلہ تھے - دہلی سے کوچ اور اکبرآباد میں قیام ہوا - شہائی کا پل دار المستقر بنا -

آگرہ کا مشاعرہ

نظیر نے آگرہ کی سکونت تو اختیار کر لی لیکن خطرات کا خوف دفع نہ ہوا۔ درّانی کی چڑھائی کا خیال روح کو تحلیل کرتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اُس کی مراجعت کے اخبار گوش گزار ہوئے اور عوام الناس کو اطمینان نصیب ہو چکا تو نظیر کو آگرہ والوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا۔ گھر میں اُن کے سوا اور کوئی مرد نہ تھا اور خانہ داری کا سارا بوجھ اُنھیں کے سر تھا۔ اس لیے اُنھوں نے سب سے پہلے گھر کا انتظام درست کیا۔ اُس سے فارغ ہونے کے بعد سوسائٹی میں شرکت شروع کی۔ اُن دنوں میر تقی میر بھی آگرہ ہی میں رہتے تھے اور اُن کی زندہ جاوید شاعری، شہرت کے پر لگائے ہوئے آسمان سخن کی فضائے بسیط میں اُڑتی پھرتی تھی۔ کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جو اُن کی شرکت سے خالی جاتا ہو نظیر تو دہلی ہی سے ذوق سخن ساتھ لائے تھے۔ دُرّانی حملے کے خوف اور شہر والوں کی اجنبیت کی وجہ سے خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب خطرے دور ہو چکے اور آہستہ آہستہ دوستوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو دو چار مقامی مشاعروں میں فن شعر سے ناواقف بن کے شریک ہوئے۔ پھر طبیعت کے اُبھارنے سے ایک مشاعرے کی طرح میں غزل تصنیف کی اور ہم رنگ دوستوں کے اصرار سے بزم سخن میں پڑھ کے سنائی ؎

نظر پڑا اک بُتِ پری وش، نرالی سج دھج، نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی، پہ قہر آفت غضب خدا کا

اس غزل نے خوب رنگ دیا۔ واہ وا! سبحان اللہ! کی دھوم مچ گئی۔ میر صاحب کی انصاف پسند طبیعت نے مہر سکوت توڑی کلام کی داد دی اور خوب دل کھول کر دی۔ دوسرے دن آگرے کے بچے بچے کی زبان پر نظیر کی غزل کے اشعار تھے۔ شائقین نے نقلوں پر نقلیں حاصل کیں۔ یوں ان کی شاعری کا افتتاح شروع ہوا اور آگے چل کے وہ اپنے رنگ میں فرد فرید تسلیم کیے گئے۔

شادی

نظیر کی روز افزوں شہرت نے اُنھیں مرجع انام بنا دیا تھا۔ کس و ناکس کی نگاہیں پڑا کرتی تھیں۔ ہر شخص محبت و عزت سے پیش آتا تھا۔ اُنھیں دنوں میں ایک شاہی احدی تاج گنج میں خرد کش تھے۔ وہ کسی زمانے میں شاہ دہلی کے

وظیفہ خوار تھے مگر اب کسی سبب سے علیحدہ کر دیے گئے تھے اور آگرہ میں امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے اوقات بسر کرتے تھے۔ خدا نے اُنھیں صرف ایک ہی بیٹی دی تھی اُس کی شادی ایک شریف زادے محمد رحمن سے ہو چکی تھی۔ چونکہ یہی ایک لڑکی تھی اور اُس کا جدا کرنا شاق تھا اس لیے اُس کے شوہر کو گھر داماد بنا لیا تھا۔ اُن دونوں کے نہالِ جوانی میں تین ثمر آئے تھے۔ خیر الدین۔ کریم الدین۔ تہور النسا۔ لڑکی شادی کے قابل تھی۔ احدی صاحب اور اُن کی اہلیہ کو نواسی کے بیاہ کا بڑا ارمان تھا۔ لیکن اُس وقت تک کوئی لڑکا نظر پر نہیں چڑھا تھا۔ یکایک نظیر کی شہرت کا آوازہ گوش زد ہوا۔ احدی صاحب نے اس جوڑ کو دل سے پسند کیا کیونکہ وہ بھی دہلی نژاد اور نظیر بھی وہیں کے رہنے والے تھے۔ اطوار و عادات خاطر پسند۔ شرافت و نجابت سندی۔ فی الفور مشاطہ کے ذریعہ سے تحریک کی گئی۔ گو اس کا لحاظ رکھا گیا کہ احدی صاحب کی خواہش ظاہر نہ ہو بلکہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ نظیر کے یہاں سے بات آئے۔ اِدھر نظیر کی ماں اور نانی نظیر کا سہرا دیکھنے کی آرزو میں ہمہ تن دیدۂ شوق بنی ہوئی تھیں۔ ذرا سا اشارہ پاتے ہی احدی صاحب کے مکان پر چڑھ دوڑیں دونوں خاندانوں میں چندے آمد و رفت رہی۔ میل جول بڑھا۔ پھر اُدھر سے رقعہ بھیجا گیا جو فوراً منظور ہوا۔ دن بدھ گیا۔ تاریخ مقرر ہوئی اور رسم و رواج کے موافق دھوم دھڑکے سے شادی ہو گئی۔

پیشہ

نظیر کو ثروت حاصل نہ تھی نہ اُن کے چھوٹے سے گھر میں شمع دولت کی نور پاشیاں ہوتی تھیں لیکن میر تقی میر یا اور بعض اہل کمال کی طرح اُن کی زندگی نکبت و فلاکت کی نظر نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے معلمی کو ذریعۂ معاش ٹھہرایا اور اس پیشہ میں سفید پوشوں کی طرح طویل عمر بسر کر دی۔ اور اکثر غربا و مساکین کی امداد کا فرض بھی ادا کرتے رہے۔ مزاج میں استغنا اور قناعت زیادہ تھی۔ آگرہ سے قدم نکالنے کو مصیبت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ راجہ بنارس کے خلف الرشید چیت سنگھ کی قدر دانی سے اُنھیں باہر جانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ ایک دفعہ شاہِ اودھ نے زادِ راہ بھیج کے طلب کیا مگر نہ گئے۔ معقول عذر کر کے ٹال دیا۔ بھرت پور سے بھی بلاوا آیا تھا۔ وہاں بھی معذرت کہلا بھیجی۔ بعضوں کا بیان ہے کہ چند روز کے واسطے گئے تھے۔ ہاں

اوائل عمر میں کچھ دنوں پولیس کی ملازمت کی تھی۔

انتقال نظیر نے نسبتہً بہت بڑی عمر پائی۔ میر و مرزا کے ہم مشاعرہ رہے۔ شعرائے قدیم کی معرکہ آرائیاں دیکھیں۔ مصحفی اور سید انشا کے زمانے میں اُن کی شاعری فروغ پا چکی تھی۔ ناسخ۔ آتش۔ غالب۔ ذوق۔ مومن کے دور میں چراغ سحری تھے۔ بڑھاپے نے جوانی کی رنگینیوں کو پھیکا کر دیا تھا۔ لہو و لعب سے تائب ہو کے زہد و پارسائی کا مجسمہ بن گئے تھے۔ روزے نماز کی پابندی۔ اور اوراد و وظائف کا ورد ہر وقت کا مشغلہ تھا۔ مرنے سے پانچ برس پہلے فالج گرا اور قریب قریب زندگی سے مایوسی ہوگئی۔ لیکن مشیتِ الٰہی کو چند سال اور اُن کا فیضانِ سخن جاری رکھنا مقصود تھا۔ جان تو بچ گئی لیکن چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ گھر کے صحن میں بیری اور نیم کے درخت تھے۔ جب سائبان یا کمرے میں دم اُلجھتا تو اُن درختوں کے سائے میں بوریہ بچھا کے بیٹھ جاتے۔ قلم، دوات اور کاغذ حاضر رہتا۔ مشق سخن جاری ہوتی۔ اس بیچ میں کوئی ملاقاتی آجاتا تو وہ بھی وہیں بلا لیا جاتا تھا۔ مکان سے نکلنا اور ہر جگہ کا آنا جانا بالکل ترک تھا۔ اسی طرح پانچ برس خانہ نشینی میں بسر ہوئی۔ پھر مرضِ موت نے ضعفِ پیری سے ساز باز کرکے پیر کے دن ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶۔ اگست ۱۸۳۱ء کو اِس ہندوستانی سعدی کی زندگی کا دِیا بجھا دیا۔ موت کی خبر مشہور ہوتے ہی ہندو مسلمانوں کا ہجوم ہوا۔ شان و شوکت سے میت اُٹھائی گئی۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ اولاً شیعوں کے طریقہ پر نماز ہوئی پھر سنیوں نے اپنے اصول پر نماز ادا کی۔ اہلِ ہنود نے بھی بعض اپنے رسوم ادا کرنے چاہے۔ لیکن نظیر کے اعزا مانع ہوئے۔ اِس پر ہندوؤں نے دھمکی دی کہ "اگر ہم کو اجازت نہ دی جائے گی تو کبیر داس اور گرو نانک کی طرح اس موقع پر بھی ہنگامہ ہوگا" ناچار میت کے وارثوں نے سکوت اختیار کیا اور ہندوؤں نے اپنے رواج کے موافق اُس چادر کو جو صندوق پر پڑی تھی ٹکڑے ٹکڑے کرکے آپس میں تبرکاً تقسیم کر لیا۔ غسل و کفن اور نماز سے فراغت کرکے اس بینظیر شاعر کو اُس کے مسکونہ مکان میں بیری اور نیم کی چھاؤں میں دفن کر دیا۔ حق شناس شاگردوں نے قبر پختہ بنوا دی۔ تاریخیں بھی تصنیف ہوئیں جو اب کمیاب ہیں۔ ایک تاریخ حاصل شدہ کا آخری مصرع یہ ہے:-

ع مخمس بے سروپا ۔ بیت بیدل ۔ فرد بے سر رشتہ ۱۲۴۶ھ

مسلمانوں کی طرف سے تیسرے دن غلام رسول کی مسجد میں پھول ہوئے اور ہندو شاگردوں نے قبر پر مشاعرہ منعقد کیا ۔ تاریخیں اور مرثیے پڑھ پڑھ کے نظیر کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ۔ عرصے تک اُن کے شاگردوں نے اُن کے بیے کا خیر کا سلسلہ جاری رکھا ۔

اولاد — نظیر نے معنوی فرزندوں کے علاوہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑی ۔ خلیفہ گلزار علی اسیر ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲۹۵ھ میں فوت ہو گئے ۔ اُن کی بہن امامی بیگم تھیں ۔ جو اپنے باپ کے سامنے صاحب اولاد ہو چکی تھیں اور اُن کی بیٹی ولائتی بیگم عرف بیگم جان اپنے نانا کی وفات کے وقت سات برس کی تھیں

کلام پر تبصرہ — نظیر کی شاعری بالکل جداگانہ ہے ۔ وہ فطرت کو صنعت سے ملا ہوا اور آبادی سے قریب تر خیال کرتے ہیں ۔ وہ جب سوسائٹی کا ذکر چھیڑتے ہیں تو اُس کی ہو بہو تصویر پیش کر دیتے ہیں ۔ نیچرل مضامین کی تلاش میں صحرا اور کہسار کی خاک چھاننے کے بدلے شہر کی سنگین فصیلوں کے اندر رہ کر مختلف کھیل تماشوں اور بالمرہ پیش آنیوالے واقعات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ اُن کا ذوق نظر خواص سے ہٹ کر عوام کو منتخب کرتا ہے اور وہ اُن کے کیریکٹر کی تصویر کشی میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ ایک طرف ہشاش بشاش لوگوں کی واہ وا ہے تو دوسری جانب مصیبت زدوں اور درد رسیدوں کی آہ آہ ہے ۔ کہیں وصل کا خوشگوار سماں ہے کسی طرف ہجر کا جگر خراش منظر ۔ وہ بنی نوع کے ہمدرد ہیں ۔ یہی نہیں کہ جذبۂ ہمدردی انسانوں تک محدود ہو بلکہ وہ اس دائرہ سے تجاوز کر کے وحش و طیور ۔ بہائم اور جمادات و نباتات تک پہونچ جاتا ہے ۔ اُنھوں نے کہیں فقیروں کی صدا لگائی ہے تو کہیں تیوہاروں کی دھوم دھام کا نقشہ کھینچا ہے ۔ ایک طرف کورے برتنوں کی سوندھی سوندھی خوشبو مشام جاں کو تازہ کرتی ہے تو دوسری طرف بلبلوں کی لڑائیاں تفریح طبع کا باعث ہوتی ہیں ۔ کبھی ہنس کی دلفریب رفتار قلب کو پامال کرتی ہے تو کسی سبزہ زار اور چراگاہ میں شوخ و شنگ ہرنوں کی چوکڑیاں دل لبھاتی ہیں ۔ اسی طرح ریچھوں کی جنگ ۔ گلہری کا شوق ۔ وغیرہ وغیرہ ایسی انمول تصویریں ہیں جو ذوق سلیم کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہتیں ۔ کبھی وہ یاران طریقت کے رنگ

میں شرابور ہو کے خود ہی کو بھول جاتے ہیں۔ کبھی دنیادار اور کبھی زاہد حق پرست بن جاتے ہیں۔ زبان سلیس و شیریں۔ ترکیبیں دل پسند۔ اُن کے خزانے میں ہندی الفاظ اور ہندی خیالات کی بھی کمی نہیں۔ جہاں جہاں ہندی تیوہاروں کا ذکر آیا ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کوئی رشی عقیدت و ارادت کا دریا بہا رہا ہے۔ پند و نصائح میں وہ تارک الدنیا صوفی ہیں۔ اگرچہ صنائع و بدائع کا خیال نہیں کرتے پھر بھی کوئی صنعت شعری ایسی نہیں جو اُن کے کلام میں نمایاں نہ ہو۔ باوجود ان خوبیوں کے اُن کے کلام میں نقائص بھی ہیں جن میں کچھ تو کاتب کے مرہون ہیں اور بعض وہ ہیں جو اُن کے زمانے میں معائب نہیں سمجھے گئے لیکن اب متروک ہیں۔ کچھ خامیاں ایسی بھی ہیں جن پر غلط العام فصیح کا قول صادق آتا ہے چونکہ وہ مذہبی اور فطری شاعر تھے اس لیے اُن کا کلام ایک خاص رنگ اور جوش رکھتا ہے اور جب تک اُردو زبان باقی ہے فنا نہیں ہوسکتا۔

تغزل غزل گوئی کے لیے گداز محبت لازم ہے۔ جس شاعر کا دل محبت کی چوٹ سے واقف نہیں اُس کی غزلوں میں درد کی لذت پیدا نہیں ہوسکتی۔ نظیر اس ذائقہ سے بے بہرہ نہ تھے۔ اُنھوں نے وصل کا مزہ اور ہجر کی تلخی چکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی غزلوں میں واقعات و تاثرات کی مصوری کی ہے۔ اُن کی غزلوں میں جذبات کی فراوانی ہے اور مضامین کی بہتات۔ اُن کے کلام میں میر کا سوز اور انشا کی ظرافت پائی جاتی ہے۔ شوخیاں جابجا دلکش معلوم ہوتی ہیں۔

تضمین سخن فہموں کا خیال ہے کہ نظیر تضمین کے بڑے مرد میدان تھے۔ اُردو میں تضمین و تخمیس کا حق جیسا اُن سے ادا ہوا ویسا دوسروں سے ادا نہیں ہوا۔ ممکن ہے اس رائے میں کسی قدر مبالغہ بھی شریک ہو تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ اس صنف سخن میں اکمل تھے۔ حافظ شیرازی کی غزلوں پر جو تضمینیں کی ہیں اُن سے اُن کی قدرت و مشق کا سراغ ملتا ہے۔

فارسی کلام کہا جاتا ہے کہ نظیر کا موجودہ کلیات اُن کے کلام کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ بعض ڈھونڈھنے والوں نے اُن کا بہت کچھ کلام تلاش کیا ہے اور ابھی جستجو جاری ہے۔ سنا جاتا ہے کہ وہ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے

لیکن وہ دیوان اُن کے وارثوں کے قبضہ میں پڑ کے تشنۂ اشاعت رہ گیا -

کلام کے نقائص

زمانہ بہت دور نکل آیا ہے - اگلے عہد اور اس دور کی زبان میں بڑا فرق ہو گیا ہے - پہلے جو الفاظ بولے جاتے تھے اب مستعمل نہیں ہیں - قدما کے کلیات و دواوین میں ایسے متروکات بکثرت موجود ہیں - چونکہ نظیر کی زبان عامیانہ خیال کی جاتی ہے اور یہ خیال ایک حد تک درست بھی ہے - لیکن اُنھوں نے جو روش پسند کی تھی اُسے نباہنے کو اُنھیں سا ہمہ داں ہونا چاہیئے تھا - اُنھوں نے جس موضوع پر نظم تصنیف کی اُس کی مناسبت سے محاورات و مصطلحات صرف کیے جو درحقیقت کمال شاعری ہے - فن کے لحاظ سے جو اعتراضات ہو سکتے ہیں اُن کے جوابات نظیر کے ہوا خواہوں کی طرف سے دے دیے گئے ہیں - ثبوت کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو -

اسقاط ع کی مثال

نظیر،
ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس دید کی خوشی

اُن کے کلیات میں متعدد جگہ عین تقطیع سے خارج نظر آئے گا اور غالباً وہ نظیر کی ناواقفی فن پر محول کیا جائے گا - مگر ایسا نہیں ہے - اُن دنوں عین کا تلفظ الف سے بدل دینا معائب میں داخل نہ تھا جس کا بڑا ثبوت نظیر کے معاصرین کا کلام ہے جو نظیر کی طرح اس نقص سے محفوظ نہیں -

سودا،
سودا تجھے کہتا ہوں نہ خوباں سے بل اتنا
تو اپنا غریب عاجز و دل بیچنے والا

درد،
غافل جہاں کی دید کو تو مغتنم سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

اسقاط ح کی مثال

نظیر،
فرمائش اگر ہو کوئی تو ہم سے وہ فرماؤ
ہم سب طرح حاضر ہیں ذرا ہم سے نہ شرماؤ

سودا: اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے لیجیے جو مول

استعارہ کی مثال

نظیر: کہتا ہے کوئی کسی سے اے دلربا ہٹیلے
ایک ہی گلابی مے کی ہاتھوں سے میرے پی لے

سودا: بس ہمت اپنے نزدیک ہے کیا بھلا کہ میں اور پرٹالوں اپنی بلا

نثر: نظیر نظم کی طرح نثر میں بھی ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ منشارت میں مبتدیوں کے لیے رقعات کا مختصر سا مجموعہ لکھا ہے جس میں متعدد خطوط ہیں اور اکثر ابتدائی تعلیم کے کام آتے ہیں۔ زبان فصیح۔ عبارت آسان۔ ایک خط کا نمونہ یہ ہے۔ ”لالہ رام ناتھ کے نام رقعہ جاتا ہے چالیس روپے اُس سے لے کر سردست کام چلائیے۔“ (رقعہ ۱۱) اس جملے سے اُن کی سلیس عبارت کا پتہ چلتا ہے۔ مجموعہ کے تمام خطوط قریب قریب اسی سلاست و روانی پر مبنی ہیں۔

افسانہ

(از جناب حکیم سراج الحق صاحب منیجر دلگداز لکھنؤ)

(۱)

خدا بخشے مولوی سید عبدالمجید صاحب ایک بہت بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے بخندہ پیشانی ملتے اور اگر ان لوگوں کا کوئی کام اُن کے ہاتھ سے انجام پا جاتا تو بہت خوش ہوتے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ ”خدا نے انسان کو پیدا ہی اسواسطے کیا ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے“ اُن کی تعلیم و تربیت کا زمانہ دیہات میں گذرا تھا۔ جوان ہوکر تلاش معاش میں لکھنؤ آئے اور پھر بوجہ ملازمت یہیں کے ہو رہے۔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اُن کی شریک زندگی نے اپنی اور اُن کی یادگار میں دو بچے چھوڑ کر انتقال کیا۔ مولوی صاحب کو سخت

تو بہت ہوا گر مشیتِ ایزدی پہ صابر و شاکر ہو کر ان چھوٹے بچوں کی خدمت گذاری میں منہمک ہو گئے۔ ان بچوں میں بڑے بچے کا نام عبدالحمید اور چھوٹی بچی کا نام ساجدہ تھا۔ ساجدہ حمید سے تین برس چھوٹی تھی اور اپنی تتلی تتلی باتوں سے باپ کا دل بہلاتی حمید جب باپ سے سبق پڑھتا تو یہ بھی اُس کے پاس بیٹھ کر نہایت خاموشی سے اُس کا سبق سُنتی اور باپ باتوں ہی باتوں میں چھوٹے چھوٹے مذہبی مسائل نہایت خوبی سے ان دونوں کے ذہن نشین کرتا جاتا۔ محنت و ذہانت عجب چیز ہے۔ حمید نے تھوڑے ہی دنوں میں کلام پاک پڑھ کر فارسی میں بھی کافی استعداد حاصل کر لی اور ساجدہ نے پہلا سپارہ شروع کیا۔

(۲)

مولوی صاحب نے حمید کی ذہانت دیکھ کر اُس کا نام قریب کے اسکول میں بھی لکھوا دیا اور غیر وقت میں بدستور فارسی و عربی کا درس دیتے رہے۔ اُس درس و تدریس اور مولوی صاحب کی ابتدائی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے ہی زمانے میں حمید اور ساجدہ اپنے پاکیزہ خصائل کی وجہ سے اہلِ محلہ کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ ہر شخص اُنھیں پیار کی نظروں سے دیکھتا اور ان کی سیدھی سادی وضع اور بھولی بھولی باتیں سُن کر خوش ہوتا۔ اسکول کے ماسٹر بھی حمید کی سادی۔ صاف سُتھری وضع اور ذہانت دیکھ کر خوش ہوتے اور اُس کی جانب خاص توجہ کرتے۔ اب حمید نے انٹرنس کا امتحان دیا اور خدا کے فضل سے سارے صوبے میں اول نمبر رہ کے گورنمنٹ سے وظیفہ حاصل کیا۔ یہ وظیفہ اس کی آیندہ تعلیم جاری رہنے کا باعث ہوا، ورنہ مولوی صاحب میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ صاحبزادے کو آگے تعلیم دلا سکتے۔ انٹرنس پاس ہو کر حمید نے اپنی بہن کو انگریزی پڑھانا شروع کی۔ اور چونکہ مولوی صاحب نے اپنی تربیت کی بدولت اس میں بھی کافی ذہانت پیدا کر دی تھی لہذا یہ جلد ہی اس قابل ہو گئی کہ کسی اسکول میں داخل کی جائے۔ مولوی صاحب پُرانی تہذیب کے دلدادہ تھے لڑکی کا اسکول میں بھیجنا کسی طرح پسند نہ کرتے تھے مگر سعادتمند لڑکے کے بار بار کے اصرار نے انھیں اپنی طبیعت کے خلاف ساجدہ کو اسکول میں داخل کرنے پہ مجبور کر دیا۔

حمید اور ساجدہ باپ کی نگرانی میں کئی سال تک انگریزی تعلیم حاصل کرتے رہے مگر ابتدائی تربیت اور باپ کی نگرانی کی یہ عجیب وغریب تاثیر نظر آئی کہ ان دونوں بچوں نے دوسرے مسلمان بچوں کی طرح اپنی وضع وحالت نہیں بدلی - باپ کی وضع اُن کی گھٹی میں پڑ گئی تھی - ہمیشہ سیدھی سادی وضع میں رہتے ہر ایک سے اخلاق سے ملتے - ادنیٰ واعلیٰ کو سلام کرنا اور اُن سے خوش خوئی سے پیش آنا اُن کا اوّلیں فرض تھا - صوم وصلوٰۃ کی پابندی ابتدا ہی سے تھی اور ہر نماز اپنے وقت پر ادا ہوتی اہل محلہ و برادری یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور مولوی سید عبدالمجید صاحب کو آآکر مبارک باد دیتے - اب ساجدہ انٹرنس میں تھی اور حمید بی - اے کے آخری سال میں کہ ناگہاں مولوی عبدالمجید صاحب انفلوئنزا میں مبتلا ہوکر انتقال کر گئے شناسا لوگوں کو حمید اور ساجدہ کی یتیمی کا افسوس ہوا - مگر کر ہی کیا سکتے تھے - ان دونوں کو سمجھا بجھا کر خاموش ہو رہے -

(۳)

خدا خود میر سامان است اربابِ توکل را

حمید اور ساجدہ دونوں اپنے اپنے امتحانوں میں کامیاب ہوگئے اور حمید نے اس خیال سے کہ ایم - اے پاس کرکے پروفیسری کی جگہ آسانی سے مل جائیگی اپنی تعلیم کالج میں جاری رکھی اور چونکہ باپ کا سایہ اُٹھ چکا تھا لہذا بہن کو بھی گھر میں تنہا چھوڑنا مناسب نہ سمجھ کر کالج کے بورڈنگ میں داخل کردیا - بے - اے پاس کرکے حمید اپنی سیدھی سادی وضع اور مذہبی پابندی کی وجہ سے شہر میں بہت مشہور ہوگیا تھا - اکثر معززین شہر اس سے ملنے کے مشتاق اور ایسے ہونہار لڑکے کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے مگر خود حمید کو اس کی خبر نہ تھی - اسی درمیان میں ایک دن کسی جلسے میں اس سے شہر کے لائق ڈپٹی کمشنر سے تعارف ہوگیا اور یہ ان کی خدمت میں آنے جانے لگا - ڈپٹی کمشنر صاحب نے اسے ڈپٹی کلکٹری اور انڈین سول سروس کے داخلے کے امتحانوں کی طرف توجہ دلائی اور یہ اُن کی بدولت دونوں امتحانوں میں شریک ہوکر کامیاب ہوگیا - یہ نتیجہ اور اُسکے حالات اخباروں میں شایع ہوئے تو شہر کا ہر کہ ومہ اُسی کے دیکھنے کا شائق ہوگیا اور عام لوگوں نے بے دیکھے بھالے تعریف کے پُل باندھ دیے - ڈپٹی کمشنر صاحب نے

کوشش کرنے کے بجائے اس کے کہ یہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کا چارج ملے اُسے جلد سامان فراہم کر کے انگلستان روانہ کر دیا اور ساجدہ کو بدستور کالج کے بورڈنگ میں رکھ کر اُس کی نگرانی اپنے ذمے لے لی۔

(۴)

نئی تہذیب کے جب ولولے بیتاب کرتے ہیں   کھڑے ہو کر وہ اپنی وضع پر میشاب کرتے ہیں
طبیعت آگئی جس روز سے تہذیب لندن پر

حمید انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر کے انگلستان سے واپس آیا تو اُس کا تقرر ضلع سارن کی اسسٹنٹ کلکٹری پر ہوا۔ مگر اب اس میں باپ کی کوئی صفت و وضع باقی نہ رہی تھی اب نہ اُسے صوم و صلوٰۃ سے مطلب تھا اور نہ باپ کی سیدھی سادھی وضع سے ہاں اب وہ ایک ایسا صاحب بہادر ضرور تھا جسے اپنے اعزا اور باپ کے ملنے والوں سے ملنے میں عار آتا تھا۔ اعزا اس کے اعزاز کی وجہ سے اُس سے ملنا چاہتے مگر وہ اُن سے ملنے میں اپنی سبکی سمجھتا اور ہمیشہ مختلف حیلے بہانے کر کے ٹال دیتا۔ اس کی نسبت اُس کی چچا زاد بہن سے ابتدا ہی میں ٹھہر چکی تھی چچا لڑکی کو بٹھائے ہوئے منتظر تھا کہ بھتیجا آوے تو عقد کر کے سبکدوشی حاصل کروں مگر بھتیجے صاحب نے انگلستان سے آکر ایسی گفتگو کا موقع ہی نہ دیا۔ آخر چچا نے مجبور ہو کر مختلف اعزا کے توسط سے باپ کی کی ہوئی نسبت کی یاد دلائی تو بھتیجے نے یہ کہکر کہ آئی۔ سی۔ ایس ہونے کی وجہ سے مجھ پر شادی کرنے میں خاص قیود عائد ہو گئی ہیں جب تک وہ پوری نہ ہو جائیں میں شادی کرنے سے معذور ہوں ٹال دیا۔ مگر اس تحریک سے اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے اپنی پسند کے موافق کہیں جلدی عقد نہ کر لیا تو میرے اعزا مجبور کر کے مجھے چچا کی لڑکی ہی کے ساتھ پھانس دینگے اور اُس کے ساتھ پڑ کر میری مٹی مفت میں خراب ہو گی۔ اس لیے اپنے دوست احباب کے ذریعہ سے اِدھر اُدھر اپنی شادی کی تحریک کرائی۔ ایسے شخص کے واسطے لڑکیوں کی کیا کمی تھی ہر طرف سے نسبتیں آنے لگیں مگر اتفاق سے کوئی نسبت اُس کی مرضی کے موافق نہ ٹھہری۔ ایک دن اخبار دیکھتے دیکھتے اُس کی نظر ایک ایسے اشتہار پر پڑی جس میں شادی کا نوٹس تھا پھر کیا تھا "دیوانہ را ہوئے بس است" یہ تو اُسی فکر میں تھے بلا تکلف اس مضمون کا اشتہار لکھ کر اُسی اخبار کے ایڈیٹر کے نام روانہ کر دیا۔ "ایک جنٹلمین سیدزادے کے واسطے جس کی عمر ۲۶ سال کی ہے اعلیٰ جو اس

وقت اسسٹنٹ کلکٹری کے عہدہ پر ممتاز ہے اور آئندہ بہت کچھ ترقی کی اُمید ہے۔ ایک دوشیزہ تعلیم یافتہ حسین وجمیل لڑکی کے ساتھ نسبت کی ضرورت ہے۔ خط وکتابت بذریعۂ ایڈیٹر ایس۔ اے کے حوالہ سے کی جائے جو ہر طرح سے پوشیدہ رکھی جائے گی۔"

(۵)

ساجدہ چھپی نہ تھی پردے سے جب بیگانہ تھی   اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ساجدہ بی۔اے کا امتحان دینے والی تھی اور وہ بھی بھائی کا رنگ دیکھ کر پہلی سی غریب سیدزادی نہ رہی تھی بلکہ اب اپ ٹوڈیٹ فیشن ایبل لیڈی تھی وہ کھلے خزانے تھئیٹروں اور سینماؤں کا تماشا دیکھتی۔ مردوں کے ساتھ ٹینس کھیلتی۔ کلبوں اور جلسوں میں شریک ہوتی غرضکہ کوئی صحبت ایسی نہ تھی جس میں وہ مردوں کے دوش بدوش رہ کر شریک نہ رہتی ہو۔ اس کا بھائی جب انگلستان سے آیا تھا تو اُس نے ہدایت کردی تھی کہ اب یہ بیجا شرم وحیا چھوڑو مردوں سے ملو جلو اور اپنے واسطے خود ہی شریک زندگی تجویز کرکے مجھے اطلاع دو۔ اتفاق سے اخبار مذکور ساجدہ کے پاس بھی آتا تھا۔ اُس نے یہ نوٹس پڑھا اور یہ خیال کرکے کہ یہ موقع شریک زندگی کے انتخاب کرنے کا اچھا ہے میز پر آکر اس مضمون کا مسودہ بناکر اور جلدی جلدی ٹائپ کرکے ایڈیٹر کے نام اس ہدایت سے روانہ کردیا کہ وہ اسے ایس۔ اے کے پاس بھیجدے۔ "جناب من میں اس سال بی۔اے کا امتحان دینے والی ہوں اور سیدزادی بھی ہوں۔ غالباً آپ کا اور میرا رشتۂ ازدواجی مفید ثابت ہو قبل اسکے کہ میں اپنا حسب ونسب وپتہ آپ کو بتاؤں یا آپ کا نام ونشان دریافت کروں مجھے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ایک نظر دیکھ لوں اور آپ بھی مجھے دیکھ لیں۔ یہ تعارف ہونے کے بعد ممکن ہے کہ میں آپ سے عرض کروں کہ آپ میرے بھائی سے جو ایک معزز عہدہ پر مامور ہیں میرے متعلق خط وکتابت کریں چونکہ خط وکتابت پوشیدہ رکھنا منظور ہے اور بار بار لکھنے پڑھنے میں راز کے افشا ہوجانے کا اندیشہ ہے لہذا میں اس کی بھی اطلاع دیتی ہوں کہ میں کب سے ۱۸ نومبر کو اتوار کے دن بنارس سٹی اسٹیشن کے متصلہ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳ میں ٹھیک ۲ بجے دن کو مل سکوں گی۔"

(۶)

مسٹر حمید تاریخ مقررہ پر اچھی طرح بن سنور کر قبل اس کے کہ دس بجیں بنارس پہونچ گئے اور ہوٹل مذکور میں جاکر منیجر ہوٹل سے کمرہ نمبر ۳ کے طالب ہوئے۔ مگر منیجر نے افسوس کرتے ہوئے

کہا کہ وہ آج شام تک خالی نہیں ہو سکتا۔ مزید استفسار پر اُس نے یہ بھی کہا کہ اُسے آج ہی صبح کو ایک خاتون نے اپنے واسطے ریزرو کرا لیا ہے۔ حمید یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اپنی کامیابی کا پورا یقین کر کے شاداں و فرحاں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ اس وقت اُن کا دل ہاتھوں اُچھل اُچھل کر اُس پری پیکر کی تلاش میں محو تھا جس کا ایک جلوہ دیکھنے کے واسطے سارن سے یہاں تک کھینچ لایا تھا۔ یہ کمرہ باہر سے مقفل تھا اور حمید کو باوجود متعدد اشخاص سے دریافت کرنے کے اپنی مطلوبہ مہ جبیں کا پتہ نہ چلا۔ بالآخر یہ خیال کر کے کہ معشوقۂ باوفا نے مجھے ٹھیک چار بجے بلایا ہے اِس وقت اُس کی نسبت کچھ دریافت کرنا بدتہذیبی ہے کرایہ کی موٹر پر بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بقیہ گھنٹے نہ معلوم کن مشکلوں سے کاٹ ٹھیک ۴ بجے کمرہ نمبر ۳ کے دروازے پر پہونچے اور وہاں ایک چھوکرے سے یہ مژدہ سُن کر "کہ مس صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں تشریف لے جائیے" کمرہ مذکور میں بلا تکلف داخل ہو گئے۔ کمرہ میں داخل ہونا تھا کہ ایک ماہ لقا یوروپین ڈریس میں اپنی کرسی سے ہاتھ ملانے کے واسطے اُٹھتی ہوئی نظر آئی مگر آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر بُت بن کر دست بدنداں رہ گئے۔ اور بالآخر یہ تماشا نظر آیا کہ، ع

وہ جھجھک کر رہ گئے اور ان کو سکتہ ہو گیا

تصانیف مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم

تاریخی ناول

نمبر	نام کتاب
۱	الفانسو
۲	ایام عرب جلد اول
۳	بابک خرمی ہر دو جلد
۴	جویائے حق حصہ اول
۵	زوال بغداد
۶	طاہرہ
۷	عزیزہ مصر
۸	رومۃ الکبریٰ
۹	مفتوح فاتح
۱۰	فلپانا
۱۱	فلورا فلورنڈا
۱۲	لعبت چین
۱۳	مینا بازار
۱۴	نیکی کا پھل

خیالی ناول

نمبر	نام کتاب
۱	آغا صادق کی شادی
۲	اسرار دربار حرامپور حصہ ۱
۳	اسرار دربار حرامپور حصہ ۲
۴	حسن کا ڈاکو کامل
۵	خوفناک محبت
۶	غیب دان دولہن

تواریخ

نمبر	نام کتاب
۱	تاریخ خلافت
۲	صقلیہ میں اسلام
۳	عرب قبل اسلام
۴	عصر قدیم

نمبر	نام کتاب
۵	مسیح و مسیحیت
۶	تاریخ یہود

سوانح عمریاں

نمبر	نام کتاب
۱	ابوبکر شبلی
۲	افسانۂ قیس
۳	حسن بن صباح
۴	خواجہ معین الدین چشتی
۵	ملکہ زنوبیہ
۶	سکینہ بنت حسین
۷	شیرین ملکہ عجم
۸	ثانی اثنین
۹	قرۃ العین
۱۰	ابوالحسنین
۱۱	ذی النورین
۱۲	سیر علما

متفرق تصانیف

نمبر	نام کتاب
۱	اسیری بابل
۲	زنانہ اور اسلام
۳	شب غم (?)
۴	اسلام کا قانون (?)
۵	الحکم الرفاعیہ (?)
۶	عائشۃ الغدر (?) حصہ اول
۷	حصہ دوم
۸	معاشرت
۹	سیر علماء
۱۰	سعدی کی دیبا (?)
۱۱	سفرنامہ امام شافعی
۱۲	معیار زندگی

نمبر	نام کتاب
۱۳	ہندوؤں کا اردو سے تعلق
۱۴	معتزلہ
۱۵	ہندوستان کی موسیقی

مضامین شرر

نمبر	نام کتاب
۱	شاعرانہ و عاشقانہ
۲	تاریخی و جغرافی
۳	سیر و رجال
۴	تحقیق مسائل شرعی و مسائل
۵	ادبی و تحقیقی مسائل
۶	اصلاح قوم و ملت

دلگداز کی مکمل جلدیں

نمبر	نام کتاب
۱	جلد دلگداز سنہ [illegible]
۲	جلد سنہ ۱۹۰۲ (?)
۳	جلد سنہ ۱۹۰[illegible]
۴	جلد سنہ ۱۹۰[illegible]
۵	جلد سنہ ۱۹۰۶
۶	جلد سنہ ۱۹۱[illegible]
۷	جلد سنہ ۱۹۱۶ء
۸	جلد سنہ ۱۹۱۷ء
۹	جلد سنہ ۱۹۱۸ء
۱۰	جلد سنہ ۱۹۱۹ء
۱۱	جلد سنہ ۱۹۲۱ء
۱۲	جلد سنہ ۱۹۲۲ء
۱۳	جلد سنہ ۱۹۲۳ء
۱۴	جلد سنہ ۱۹۲۴ء
۱۵	جلد سنہ ۱۹۲۰ء (?)
۱۶	جلد سنہ ۱۹۲[illegible]ء
۱۷	جلد سنہ ۱۹۲۶ء
۱۸	جلد دلگداز سنہ ۱۹۳۰ء (?)
۱۹	جلد سنہ ۱۹۳۱ء
۲۰	منتخب مضامین

تصانیف مولوی محمد صدیق حسن صاحب

نمبر	نام کتاب
۱	یادداشت مکمل حصہ دوم
۲	〃 〃 سوم
۳	〃 〃 چہارم
۴	〃 〃 پنجم
۵	دولت ہسپانیہ عرب حصہ سوم
۶	〃 چہارم
۷	〃 پنجم
۸	مجذوب

تصانیف مرزا محمد عسکری صاحب

نمبر	نام کتاب
۱	[illegible]
۲	[illegible]

تصانیف حکیم سراج الحق (?)

نمبر	نام کتاب
۱	[illegible] حصہ اول
۲	[illegible]
۳	[illegible]
۴	[illegible]
۵	[illegible]
۶	نیرو زرتشا (?)
۷	[illegible]
۸	[illegible]
۹	[illegible]

ملنے کا پتہ:- منیجر رسالہ دلگداز [illegible]

دلگداز

(۱) یہ رسالہ مولانا شرر مرحوم کی یادگار میں ماہانہ شایع ہوتا ہے۔

(۲) اس میں ادبی اور تاریخی مضامین ہوتے ہیں۔

(۳) ایڈیٹر کے علاوہ دیگر مضمون نگار اصحاب کے مضامین بھی شایع ہو سکیں گے۔

(۴) ہر رسالے کا حجم کم سے کم ۴۲ صفحے ہوتا ہے۔

(۵) چندہ سالانہ مع محصول ڈاک ایک روپیہ آٹھ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکہ عثمانیہ) وی پی کی صورت میں ۳ وی پی کی رجسٹری کے شامل کرکے ایک روپیہ گیارہ آنے کا وی پی ہوگا۔ (علاقہ سرکار عالی میں وی۔ پی ایک روپیہ چودہ آنے سکۂ عثمانیہ کا ہوگا)

(۶) خط و کتابت محمد صدیق حسن ایڈیٹر دلگداز اورنگ آباد دکن سے ہونے کی جائے۔

(۷) اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحے کے چار روپیہ۔ اگر زیادہ وقت کے لیے اشتہار دیا جائے گا تو اس اجرت میں ۶ ماہ کے لیے ۱۰ فیصدی اور ایک سال کے لیے ۱۵ فیصدی کمی کردی جائیگی۔

(۸) ایک صفحے سے کم اشتہار نہ لیا جائے گا اور اجرت ہر صورت میں پیشگی لیجائیگی

Registered No. B 3126

رجسٹری شدہ سرکار عالی نمبر ۱۳۳

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم و مغفور

کی یادگار

رسالہ

دلگداز

جلد ۳۲ [illegible] نمبر

۱۹۳۳ء

مرتبہ

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

مطبع دلگداز اورنگ آباد دکن میں چھپا

اور باہتمام [illegible] شائع ہوا

سالانہ چندہ ۵؎ فی پرچہ [illegible] مع محصول ڈاک



اب مولوی نور محمد صاحب نے مجھے حدیث کا شوق دلایا۔ چنانچہ میں نے اُن سے پہلے اصول حدیث میں کتاب نخبۃ الفکر پڑھی۔ اور بعد ازاں جامع ترمذی شروع کردی جس کو انھوں نے بڑی تحقیق سے پڑھایا اور میں نے محنت اور کوشش سے پڑھا۔ اُس کے ختم ہوتے ہی مولانا نور محمد صاحب نے مجھے دہلی میں جاکر مسند الوقت مولانا محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے حدیث پڑھنے کا شوق دلایا اور میں فوراً آمادہ ہوگیا۔

اسی زمانے میں اپنے حقیقی ماموں حکیم سعد الدین صاحب مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ میرا عقد نکاح ہوگیا۔ یہ ۱۲۹۵ھ م ۱۸۷۸ء میں جبکہ میری عمر ۱۸ سال کی تھی۔

والد مرحوم میری شادی کرنے کو کلکتہ سے لکھنؤ میں آئے تو پھر واپس نہ گئے۔ اور بادشاہ کی ملازمت چھوڑدی۔ میرے لکھنؤ چلے آنے اور اپنے تنہا رہ جانے کے باعث اب اُن کا جی ٹیا برج جانے کو نہ چاہتا تھا۔ کچھ

کشمیری پنڈت اُن کے شاگرد تھے جو برسرِ عروج تھے اور والد کا بہت کچھ ادب و احترام اور پاس و لحاظ کیا کرتے۔ ان میں سے ایک پنڈت بشن نرائن تھے جو ان دنوں دہلی کے نامی وکیلوں میں سربرآوردہ تھے۔ والد اُن سے ملنے کو دہلی تشریف لے گئے اور کلکتہ سے اپنی برخاستہ خاطری بیان کی تو انھوں نے کہا آپ کا وہاں جانے سے اچھا ہے کہ آپ میری محرری کریں۔ یہاں آپ کو پچاس ساٹھ روپیہ سے کم نہ ملیں گے۔ اور کہا آپ میرے ساتھ کھائیں۔ چنانچہ والد نے قبول کر کے دہلی کی سکونت اختیار کر لی۔

اگرچہ شادی کا پہلا سال بڑے ذوق و شوق کا ہوتا ہے مگر میرے دل پر طلب علم کا شوق اس قدر غالب تھا کہ بغیر اس کے کہ عزیزوں میں سے کسی کو بھی خبر کروں اپنی اُسی مولوی حامد حسین صاحب کے وہاں کی ماہوار سے دس روپیہ جمع کر کے شادی کے چھ ماہ بعد یک بیک گھر سے غائب ہو کر ۱۳۱۲ھ میں دہلی پہونچا۔ اور مولوی نور محمد صاحب کا خط میاں صاحب قبلہ یعنی مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیا۔ انھوں نے فوراً اپنے خاص مدرسے میں رہنے کو جگہ دی۔ اور اپنے گھر سے کھانا مقرر فرما دیا

مدرسے میں قیام کرتے ہی صحیح بخاری شریف کے سبق میں شریک ہو گیا جو صبح کو کچھ دن چڑھے سے شروع ہوتا۔ اور یہی وہاں کا معرکۃ الآرا سبق تھا جس میں مختلف مقامات اور شہروں کے چالیس پچاس طلبہ شریک ہوتے اور احادیث سے جو فقہی مسائل مستنبط کیے جاتے ہیں اور مسالک فقہائے سلف کے متعلق بحث ہوتی۔ سخت رد و قدح ہوتا۔ اور میاں صاحب اپنے تبحرِ علم سے سب کو قائل کر کے ثابت کر دیتے کہ بخاری کا مذہب ہی صحیح ہے۔

میں ڈھائی سال میاں صاحب کے مدرسے میں رہا۔ پوری بخاری ختم کی جس کا سلسلہ سال بھر رہا۔ صحیح مسلم ابوداؤد اور نسائی اور مؤطا امام مالک دوسرے اوقات میں ختم کیں۔ ماہ مبارک رمضان میں تفسیر جلالین پڑھی۔ سبق کے علاوہ طلبہ میں باہم ہمیشہ مناظرہ ہوتا رہتا۔ اور احادیث اور رجال پر نظر وسیع ہوتی جاتی۔

میری دہلی کی زندگی پارسایانہ اور بالکل بے نفسی کی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں جماعت سے پڑھتا۔ شب و روز مطالعۂ کتب میں مشغول رہتا۔ میاں صاحب کے ایک داماد تھے وہ کہنہ مشق شاعر تھے اور اچھا کہتے تھے۔ مجھے لکھنؤ کا خیال کرکے وہ اپنی صحبت میں کھینچنا چاہتے مگر مجھے اس صحبت سے وحشت ہوتی۔ لمبا کرتا اور شرعی اونچا پاجامہ پہنتا۔ اور اکثر تہمت باندھے رہتا۔ یہاں تک کہ مجھے تہمت باندھے بازار جانے میں تامل نہ ہوتا۔ معمولی دوپلڑی ٹوپی سر پر رہتی۔

دلی میں مجھ سے صرف مولوی منصور علی خاں صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی جو عیسائیوں کی تردید میں مشہور تھے اور اپنے آپ کو امام فن مناظرہ کہتے۔ وہ مشہور ادیب اردو مولوی ناصر علی اور ایڈیٹر نصرت الاخبار مولوی فطرت علی کے والد تھے۔ مجھ سے وہ بڑے لطف و محبت سے ملتے مگر وہ مجھے ایسے ذی علم نہیں نظر آئے جیسا کہ سنتا تھا یا جیسا وہ دعویٰ کرتے تھے۔ ان کی عربی دانی بہت ناقص تھی۔ اور انگریزی بالکل نہ جانتے تھے۔ مگر رد نصاریٰ میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اور قرآن سے ثابت کرتے کہ مناظرہ و تبلیغ ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اس زمانے میں مجھے نہ کسی سے ملنے کی فرصت تھی۔ نہ دہلی کے

دیبوں اور شاعروں سے ملنے کا کبھی اتفاق ہوا۔ حنفیوں اور اہل حدیث کے نزاعی مسائل پر جھگڑے اور بحث کرنے کے علاوہ ہمیں دنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ تھا۔

اسی اثنا میں پہلے پہل مولوی الطاف حسین صاحب حالی کا مسدس جس کو ابھی زیادہ شہرت نہیں ہوئی تھی اتفاقاً میرے ہاتھ آگیا۔ میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا اور ایسا لطف آیا کہ کئی بار پڑھا۔ اگرچہ میرے مذاق اور طرز زندگی میں اُس سے کوئی تغیر نہیں ہوا مگر میرے دل پر مسلمانوں کے عروج و زوال کی اس سچی تصویر دکھانے والی نظم کا بڑا اثر پڑا۔

زمانۂ قیام دہلی میں ایک بار ایک ہفتہ کے لیے وطن آنے کی ضرورت پیش آئی۔ واپسی میں ایک طالب علم دوست سے ملنے کو میں دو چار روز کے لیے علی گڈھ میں ٹھہرا۔ میرے دوست مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اسرائیلی کے گھر میں رہتے تھے۔ میں بھی وہیں ٹھہرا۔ مولوی اسماعیل سے ملاقات ہوئی جو عقیدۃً اہل حدیث اور علی گڈھ میں غیر مقلدوں کے مرجع وماوی اور مباحث متنازعہ کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ اُن سے مولوی محمد لطف اللہ صاحب سے مخالفت تھی۔ مولوی لطف اللہ صاحب معقولات عربی کے اعلیٰ اور نامور مدرس تھے خصوصاً پرانے فن ریاضی و ہیئات کے متبحر عالم مانے جاتے۔ اور وہی جامع مسجد علی گڈھ کی امامت پر بھی مقرر تھے۔ اُن کے وہاں طلبہ کا ایک بڑا بھاری گروہ رہا کرتا۔ جن سے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے طالبعلموں سے جھگڑے رہتے اور کبھی کبھی مارپیٹ کی بھی نوبت آجاتی۔

لیکن میں نے غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ خود مولوی اسماعیل صاحب ان اختلافات میں اتنے متشدد نہ تھے جتنے کہ ان کے طلبہ اور گروہ والے تھے۔ ان جھگڑوں میں اگرچہ مجھے دلچسپی تھی مگر جو صورت اور حالت یہاں پیدا ہوگئی تھی مجھے اچھی نہ معلوم ہوئی۔

(۵)

سیر عراق عجم کردستان و الجزیرہ

از

(جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب)

بغداد

۵۔ اکتوبر۔ آج میں صرف زبیدہ کی قبر اور کرخ کے مزارات کی سیر کو بغداد گیا۔ زبیدہ کی قبر جو کرخ کے مزارات سے باہر ہے۔ وہ ایک عجیب قسم کی عمارت بنی ہے یعنی وہ کوئی گنبد دار عمارت نہیں ہے۔ بلکہ ایک مخروطی شکل کی ہندوؤں کے مندر کی طرح ہے یہ پختہ عمارت نہیں۔ زبیدہ کی قبر خلافت بغداد کی ایک یادگار باقی ہے۔ قبر کے پاس میں نے اسلام کے اُس روشن زمانے کو دل میں لاکر مراقبہ کیا۔ سعدی علیہ الرحمہ نے سچ کہا ہے سہ

بر این کہ میگذرد دل منہ کہ دجلہ بسے پس از خلیفہ بخواہد گذشت در بغداد

کرخ کے قبرستان میں سب سے پہلا مزار حضرت معروف کرخی کا ہے۔ سلطان عبد الحمید نے اس کے گنبد اور دروازے کو از سرِ نو تعمیر کرایا ہے۔ معروف کرخی کے پاس ہی جنید و سری سقطی و بہلول رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مزارات ہیں۔ بہلول کی قبر کے چاروں طرف بہت چیتھڑے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ چونکہ بہلول زندگی کی حالت میں دیوانہ وار

رہتے تھے اور اپنے بدن پر ایسے ہی چھڑے لگائے رہتے تھے۔ مرنے کے بعد بھی یہ نشان باقی رکھا گیا۔ مجاور نے بتایا کہ عورتیں یہاں منت مانگنے آتی ہیں تو ایسے چھڑے باندھ جاتی ہیں۔ اور جب وہ منت پوری ہو جاتی ہے تو یہ آپ سے آپ کھل جاتے ہیں۔ بہلول کی قبر پر میں نے کئی سکھوں کو زیارت کرتے ہوئے پایا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آخر تم کو ان سے کیا مطلب۔ انھوں نے کہا کہ یہ گرو نانک کے چیلے تھے۔ اور جب گرو نانک مکہ گئے تو بہلول کو بغداد میں مرید کیا تھا۔ اگرچہ یہ باتیں خلاف واقعہ ہیں کیونکہ گرو نانک بہلول سے چار سو برس بعد ہوئے ہیں۔ مگر عربوں کو اچھے خوش عقیدہ پجاری ہاتھ لگے ہیں۔ اور بہلول کی قبر کچھ تعجب نہیں کہ بغداد میں سکھوں کا گوردوارہ ہو جائے۔ شبلی کا مزار میں نے کرخ میں نہ پایا۔ معلوم ہوا کہ ان کا مزار کاظمین میں ہے۔ امام حنبل کا مزار بھی اسی طرف تھا۔ مگر اس کا بھی وجود نہیں اور وہ دریا کی ایک طغیانی میں بہہ گیا۔

کرخ میں منصور کا بھی مزار ہے۔ منصور کو میں مسلمان تصور نہیں کرتا اور میرے نزدیک وہ زندیق تھا۔ اور اس کا شمار علمائے عرب نے ان دجالین میں کیا ہے جن میں مقنع۔ بابک خرمی جس میں حسن بن صباح کے نام ہیں اس لیے میں نے اس کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھا۔ اس قبرستان میں بنی اسرائیل میں سے ایک نبی یوشیا کی قبر بھی مجھ کو دکھلائی گئی۔ ایک بہت اونچا چبوترہ ہے جس پر عبرانی حروف لکھے ہوئے ہیں۔ اس قبر کی زیارت کو یہودی آتے ہیں۔ ناظم پاشا مرحوم نے اپنے وقت میں اس کی مجاوری بھی ان کو دے دی تھی۔

فرابجات - بلد - اسطبلات و سامرہ

فرابجات - السلیخ سے آگے دریا کے کنارے کوئی تین میل پر ایک اور گاؤں ہے - جہاں کچھ دنوں میرا قیام رہا - اس کو چھلداری بھی کہتے ہیں - چھلداری میں کوئی بات قابل لحاظ نہیں چند کھجوروں کے جھنڈ ہیں - دس بارہ مکانات ہیں جو کیمپ سے دور ہیں - چھلداری کے قیام میں میں کئی بار بغداد گیا - جو راستہ السلیخ ہو کر جاتا ہے وہ عمدہ درختوں و سبزہ سے دریا کے کنارے بہت شاداب ہے - مگر دوسرا راستہ خشک میدانوں سے جاتا ہے - دجلہ کے کنارے ایک دو ہی فرلانگ تک باغات اور سبزہ ہوتا ہے - اس کے بعد بالکل صفاچٹ میدان - ایک بار میں بغداد کے اوپیرا یعنی ناچ گھر میں گیا - ناچنے والی عورتیں تو گا یہودی ہوتی ہیں - اور شاید حسن و ناز میں ہندوستان میں کوئی اپنا ثانی نہ رکھتی ہوں گی - ناچنے والی کے سازندے کرسی پر پیچھے بیٹھے رہتے ہیں جو سارنگی اور دف بجاتے ہیں - عورت ناچنے کے وقت اپنے بدن کو بہت مٹکاتی ہے - جو بعض وقت بے حیائی کی حد تک پہنچ جاتی ہے - جیسے ہولی کے دنوں میں میرٹھ کی طرف کی جاٹنیاں ناچتی ہیں - اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں کوئی بجنے والی چیز پہنے رہتی ہے جو ناچنے کے وقت بجاتی جاتی ہے - جب وہ عربی کا ایک شعر پڑھتی ہے تو جو پیچھے کرسی پر بیٹھے ہوئے اس کے سازندے جو کوٹ پتلون کالر اور نکٹائی میں ہوتے ہیں اس کو مل کر گاتے ہیں - اور اس کے بعد عورت رقص کرتی ہے - رقص کے درمیان میں تماشہ دیکھنے والے چھوٹے چھوٹے سکے اس پر پھینکتے ہیں - پہلے قطار کی نشست پر بھی اور چند اور ہندوستانی افسر تھے - ایک بار ہم لوگوں نے بھی ہمت کر کے کچھ پیسے پھینکا دیئے

عورت فوراً رک کر اور یہ سمجھ کر کہ یہ بہت بڑی تحسین ہے اس کو چھیننے لگی۔ مگر وہ چند آنے ، پیسے نکلے۔ اس کو ہاتھ میں لے کر حاضرین کو دکھلاتی جاتی اور ناچ ناچ کر کچھ عربی شعر گاتی جس پر سب قہقہہ لگاتے چونکہ اس میں خیاط الهنود یعنی ہندی افسر کا لفظ اکثر آیا۔ میں سمجھا کہ یہ ہم سبھوں کو بنا رہی ہے آخر تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ خفیف ہوکر اٹھ گئے۔

۲۲ اکتوبر۔ آج کیولری ڈویژن سامرہ کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ میں بھی اس کے ہمراہ ہوں۔ ۲ بجے رات کو سعدیہ ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ اور یہاں کوئی چھ سات دن تک ٹھیرا۔

۲۹ اکتوبر آج سعدیہ سے پھر کیولری کا مارچ ہوا۔ بادشمال یعنی سخت اندھڑ چل رہا ہے۔

۳۰ اکتوبر۔ آج بلد میں قیام کیا۔ بلد بغداد ریلوے اسٹیشن پر واقع ہے۔ شہر میں نے نہیں دیکھا۔ چند مزارات قریب واقع ہیں جو کسی امام زادے کے مزار ہیں۔ مجھ کو اس وقت نام یاد نہیں رہا۔ رات کو بلد سے روانہ ہوا۔ اور دوسرے روز ایک مقام اسطبلات پہونچا۔ ہر طرف خشک اور بیابان ہے۔ ہم لوگ بغداد ریلوے کی پٹری کے راستے جا رہے ہیں۔ اسطبلات بھی بغداد ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ اسطبلات میں رات کو ایک میدان میں پڑاؤ کیا کچھ ترشح ہو رہا تھا۔ میں نے ایک گڑھا پاکر اس کے اندر اپنا بستر بچھا لیا۔ صبح اٹھ کر دیکھتا ہوں۔ تو میرے بستر کے نیچے کسی مردے کی لاش تھی۔ گویا میں قبر میں سویا ہوا تھا۔ اس میدان میں صبح کو اور متعدد لاشیں پڑی ہوئی ملیں۔ بعضوں کا سر ندارد تھا بعضوں کا پیٹ بعضوں کے منھ پر برساتی اڑھائی ہوئی تھی۔

بعض کے پیروں پر امیونیشن بوٹ اور پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بغداد کے بعد اس میدان میں ترکوں اور انگریزوں کی ایک بڑی سخت جنگ ہوئی تھی۔ اور ہزاروں لاشیں بغیر دفن کیے یوں ہی پڑی رہ گئیں زیادہ تر لاشیں ایسی ملتی تھیں جن کے اوپر انگریزی کپڑے تھے بہت دور تک گھوڑے کے پیر کے نیچے ایسی لاشیں آ گئیں۔

۳۱ اکتوبر۔ آج غروب آفتاب کے وقت ہم نے سامرہ کے مقابل دریا کے کنارے پڑاؤ کیا۔ صبح میں اٹھا تو سامنے سامرہ کی مسجد کا سنہرا گنبد آفتاب میں چمک رہا تھا۔ سامرہ بالکل خشک زمین اور بیابان میں واقع ہے۔ اور کسی درخت کا پتہ نہیں۔ جس طرف ہم نے پڑاؤ کیا ہے۔ اس سے کوئی آدھ میل ہٹ کر بغداد ریلوے کا سامرہ اسٹیشن ہے۔ شہر سامرہ جانے کے لیے ایک پل سے عبور کرنا پڑتا ہے۔ سامرہ میں ہمارا قیام ایک ہفتے تک رہے گا۔ کیونکہ لڑنے والے سوار امام دور کی طرف ترکوں سے لڑنے کے لیے جائیں گے۔ اور ہم کو ان کی واپسی تک یہیں ٹھہرنا ہوگا۔

۵ نومبر۔ آج میں سامرہ دیکھنے گیا۔ دریا پر ایک کشتی کا پل ہے۔ دریا کے کنارے بہت اونچے ہیں۔ اور پل کے بعد اوپر زینہ پر چڑھنا پڑتا ہے۔ کنارے قبور اور مکانات کے نشان ہیں اور ہر طرف ریگستانی اور بنجر زمین ہے۔ کنارے سے کوئی ایک فرلانگ پر سامرہ کی شہر پناہ ہے۔ دروازے پر گورکھوں کا پہرہ تھا۔ مگر مجھ سے کچھ پوچھا نہیں۔ سامرہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ [illegible] سے زائد میں چار پانچ سو مکانات ہوں گے۔ بہت سے مکانات خالی پڑے ہوئے ہیں۔ بعض گلیاں تو بالکل سنسان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انگریزی قبضہ ہوتے ہی بہت سے لوگ خوف سے مکان چھوڑ کر

بھاگ گئے۔ بازار میں بالکل سناٹا تھا۔ کہیں دو ایک دکانیں کھلی نظر آتی تھیں۔ جس میں بعض میں کپڑے اور بعض میں کھانے کی چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ سامرہ کے چاروں طرف شہر پناہ ہے۔ جس کا دور دو میل سے زائد نہ ہوگا۔ سامرہ کے مزارات پر میں گیا۔ مزار کی مسجد بھی عالیشان ایرانی طرز کی بنی ہوئی ہے۔ سامنے کا دروازہ بہت بلند ہے جس پر چینی کے نقش و نگار ہیں۔ اندر قبر کے پاس شیشہ آلات وغیرہ کی کاظمین کی طرح آرایش ہے۔ امام تقی اور امام نقی رضکے مزارات پر مجاور مجھ کو لے گئے۔ اور میں نے وہاں فاتحہ پڑھا۔ مسجد کے پاس ایک چھوٹا سا حجرہ ہے۔ اس میں ایک غار ہے۔ جس کے چاروں طرف سنگ مرمر کے پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اُس حجرہ پر ایک علٰحدہ گنبد ہے۔ یہ غار مشہور امام مہدی کا بتایا جاتا ہے جو حکومت عباسیہ میں یہاں آکر چھپے تھے اور جیسا شیعوں کی روایت ہے وہ اس کے اندر سے غائب ہو گئے اور بروز قیامت یہیں سے نمودار ہوں گے۔ مسجد کے باہر صحن میں چند گھڑے رکھے ہوئے تھے مجاور نے کہا اس میں پیسے ڈالیے۔ میں نے ایک پیسہ اُس میں ڈال دیا۔ جس پر مجاور بہت چیں بجبیں ہوا۔

مسجد کے باہر چند قہوہ خانوں کی دکانیں ہیں۔ ایک دکان پر بہت سی کھالیں لومڑیوں کی بک رہی تھیں۔ جس کو انگریز بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ اور یہی ایک چیز یہاں سب سے زیادہ بکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سامرے کے مغرب جانب دروازے کے باہر قدیم سامرے کا خرابہ ہے۔ جس میں ایک مسجد کا منارہ بنا کردہ خلیفہ متوکل اب تک باقی ہے۔ اس منارے میں چکر دار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز یا کوئی اور قدیم تحریر

مجھے نظر نہ پڑی۔ یہ خرابہ سامرے کا بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

اہل سامرہ مجھے اہل بغداد سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ بہت سرخ و سپید ہوتا ہے۔ مگر اکثروں کی آنکھیں میں نے خراب دیکھیں۔ یہاں کے لوگ فارسی تقریباً سب سمجھتے ہیں اور عجب نہیں کہ ان کے خون میں کثرت سے عجمیت کا میل ہو۔ میں ان کے اخلاق و عادات کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میرا قیام سامرہ میں آدھے دن سے زیادہ نہیں ہوا۔ سامرہ میں ایک بڈھا کابلی مجھے ملا۔ اپنی عمر ایک سو دس برس کی بتاتا تھا۔ ستر برس سے سامرہ میں مقیم ہے۔ مجھ سے کہتا تھا مکان پر چلو۔ میں ساتھ ہو لیا۔ وہ ہے اور اس کی ایک بڑھیا بیوی اور دو جوان لڑکیاں جو میرے سامنے بے حجابانہ آئیں۔ معلوم نہیں یہ بڈھا مجھے کس مطلب سے اپنے گھر لایا ہے۔ بظاہر اس کی کوئی حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے زبردستی کھانا کھلایا۔ اور میں نے چلتے وقت اس کو ایک نوٹ نکال کر دیا جس سے اس نے انکار کر دیا۔ مجھ سے فارسی میں سوال کیا کہ آیا میں سید ہوں میں نے کہا ہاں پھر میں نے کہا تم شیعہ ہو یا سنی۔ اس نے کہا سنی اور یہاں مجھے کوئی سنی سوا تمہارے دکھائی نہ دیا میں نے کہا پھر تم سامرہ میں کیوں پڑے ہوئے ہو۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک زمانے میں گھومتا پھرتا وہ سامرہ میں آنکلا تھا۔ یہیں شادی کر لی۔ اور رہ پڑا۔ غالباً اس نے مجھے بھی اپنی طرح آوارہ گرد جانا۔ اور شاید یہی سمجھا کہ میں بھی اس کی تقلید میں سامرہ میں متقاعد ہو جاؤں۔

۹ر نومبر۔ آج کیولری ڈویژن واپس آ گیا۔ تکریت سے ترکوں کو پیچھے ہٹا دیا گیا مگر ہمارا نقصان بھی معتد بہ ہوا۔ آج ہی

دس بجے واپسی کا کوچ ہوا۔

۱۱؍ نومبر۔ آج سعدیہ واپس آیا۔ یہاں کیولری ڈویژن عرصے تک قیام کرے گا۔ خیمہ جات اور تمام اسباب پیچھے فرابجات میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ دو روز کے بعد میں اپنے رجمنٹ کا سامان لینے کے لیے فرابجات بھیجا گیا۔ فرابجات سے لوٹتے ہوئے راستہ میں ایک جگہ اسٹیمر دریا میں پھنس گیا۔ ہرچند اس کے نکالنے کی کوشش کی گئی اور ہم لوگوں نے اتر کر کنارے پر رسیوں سے اس کو کھینچا بھی مگر نہ نکال سکا۔ دو روز اسی طرح دریا پر پڑے رہے۔ راشن بھی تمام صرف ہو گیا۔ آخر کار سعدیہ سے موٹر کشتیاں آئیں اور وہ ہم کو سوار کر کے لائیں۔ جہاں ہم شام کو پہنچے۔

۳۰؍ نومبر۔ آج کیولری ڈویژن پھر ایک نامعلوم مقام کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ غالباً جبل حمرین کی طرف شاط الاوہم کے کنارے۔

۱؍ دسمبر۔ آج ہم نے ایک جگہ پر مقام کیا جس کے سامنے دور پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں دکھائی پڑ رہی ہیں۔ رسالے اسی پہاڑی کی طرف لڑنے گئے تھے۔ پہاڑی کی طرف سے توپوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ اور دوربین کو لے پھٹتے ہوئے اور دھواں اٹھتا ہوا دکھلائی دے رہا تھا۔ آج ہی ترکوں کے دو ہوائی جہاز بھی کیمپ پر دکھلائی پڑے جن کی طرف گولہ باری کی گئی۔

۳؍ دسمبر۔ میں اچانک بیمار پڑ گیا۔ اسپتال گیا اور اسی روز پیچھے بھیج دیا گیا۔ اس وقت ایک اسپتالی جہاز سکلر پر بخار میں پڑا ہوں۔ دو روز اس جہاز پر رہا۔ اس کے بعد ایک موٹر کشتی پر بٹھلا کر سعدیہ پہنچایا گیا۔ اور اسی روز ٹرین پر بغداد بھیج دیا گیا۔ بغداد میں بھی ایک ماہ کے قریب بیمار رہا۔ اچھے ہو جانے پر ۲۸؍ دسمبر کو پھر سعدیہ واپس بھیج دیا گیا۔

سعدیہ اور منصورہ

سعدیہ پہنچنے کے روز ہی ترکوں کے دو ہوائی جہاز کیمپ پر آئے اور دو تین بامب بھی پھینکے۔ ایک بامب بالکل ہمارے رہنے کے مقام سے کوئی دس قدم پر گرا تھا۔ بامب گرنے پر سخت آواز کا دھماکہ اور نہایت غلیظ دھواں پھیل گیا۔ ہوائی جہاز نے دو تین بامب اور بھی کیمپ پر پھینکے جس سے کچھ نقصان جان بھی ہوا۔

کہتے ہیں کہ سعدیہ وہی جگہ ہے جہاں پر قدیم شہر اوپیس آباد تھا۔ دریا کے کنارے جہاں پر ہمارا کیمپ ہے۔ وہاں کی زمین بہ نسبت دوسری جگہ کے زیادہ ناہموار تھی اور ممکن ہے کہ تودۂ خاک کے نیچے قدیم عمارتوں کا پتہ چلے۔ بالفعل سعدیہ ایک گاؤں ہے جو کیمپ کے دوسری جانب دریا واقع ہے۔ اور وہاں سے ایک راستہ یعقوبہ اور ایران کو جاتا ہے۔ ترکوں نے جب جرمنی کو بغداد ریلوے کا اجارہ دیا تھا تو اس کی ایک شاخ براہ سعدیہ سرحد ایران تک پہنچنے کی بھی ایک تجویز تھی۔ چنانچہ سعدیہ تک ریل بن بھی چکی تھی۔ مگر اس کے بعد جنگ کے سبب سے تمام ارادے اور تجاویز بالائے طاق ہو گئیں۔ آئندہ خدا کو معلوم ہے کہ اس ریلوے کے اجارہ دہندگان اور اجارہ داران میں سے کوئی اس ملک میں ریل بنانے کے لیے باقی بھی رہ جائے گا۔ سعدیہ اور ہمارے کیمپ کے درمیان ایک کشتی کا پل بنایا گیا ہے کیونکہ زیادہ تر دیہات جہاں سے فوج کو مقامی سامان رسد مل سکتا ہے وہ دریا کے دوسری طرف واقع ہیں۔

سعدیہ کے پاس دو اور دیہات ہیں اور اس سے ۴ میل ہٹ کر ایک بڑا قصبہ ہے جس کا نام دستاوہ ہے۔ کوئی تین چار میل کے نیچے

ایک اور بڑا دیہات منصورہ ہے ایام خلافت عرب میں یہ دونوں عراق کے مشہور شہر تھے مگر اب گھٹ کر دیہات کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں سوائے منصورہ کے مجھے اپنے ایام قیام سعدیہ میں کوئی عربی دیہات دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اس کا موقع یوں ملا کہ منصورہ کا ایک بڑا زمیندار ایک ترکی نژاد عرب ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا باغ تھا جو غفلت اور لاپروائی سے یا جیسا خود اس کا بیان ہے ترکی فوج کے دریا کے بند کاٹ دینے کی وجہ سے سوکھ گیا تھا۔ میری غیر موجودگی میں اس نے ایک مصری ترجمان کے ذریعہ سے اس باغ کی تمام لکڑیاں فوج کو تین ہزار روپے میں فروخت کر ڈالیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کیونکہ عراق میں جلانے کی لکڑیاں بہت کم یاب ہیں اور مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات فوج نے آٹھ آنے سیر کے حساب سے خریدی تھیں۔ بہرحال وہ مصری تو اپنا الو سیدھا کرکے الگ ہوگیا اور معاملات کا اختتام میرے ذمے آیا۔ اور مجھے اس سلسلے میں کئی بار اس ترکی نژاد عرب سے ملنے کے لیے منصورہ جانا پڑا۔ اس شخص کا نام آصف آفندی تھا۔ مُسن آدمی ہے۔ گھر پر عربی لباس پہنتا ہے۔ باہر نکلنے کے لیے یوروپین لباس اور کلپاک۔ نسلاً لازمی ہے جو قفقاس کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ دیہات میں اس کا جو مکان ہے وہ بھی صاف ستھرا اور معقول ہے۔ جس میں لوہے کی گدّے دار کوچ اور کرسیاں تھیں۔ یہ میں اس لیے لکھتا ہوں تاکہ ہمارے ناظرین کو اندازہ ہوجائے کہ عراق عرب کے عام دیہاتی زمیندار اشیاے جدید کے اختیار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتے۔ میرا اکثر عربی دیہاتوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اگرچہ مکین و مکان دونوں عموماً غلیظ اور ناپاک ہوتے ہیں مگر جس عرب کو ذرا بھی مغرب کی ہوا لگی اور اس نے

فوراً اپنی دلق کہنہ اُتار پھینکی - جو دیہات دریا کے کنارے پر تھے وہاں آب پاشی کے لیے زمینداروں کے آئل انجن چلتے ہیں -

خیر - آصف آفندی نے پہلی ملاقات میں بڑا انپاک سے خیر مقدم کیا - اور دن کا کھانا مجھے اپنے ساتھ کھلایا - کھانے میں لوبیا کی ترکاری اُبالی ہوئی جس کو عرب باقلہ کہتے ہیں - خشکہ اور انڈا جو گھی اور کھجور کے ساتھ ملا کر پکایا گیا تھا - کھانا میز پر چنا گیا تھا - پلاؤ کو چمچوں سے کھاتے تھے اور اسی طرح باقلہ اور انڈے اور درمیان میں ایک موٹی روٹی جس کو خبز بولتے ہیں اس کا چھوٹا ٹکڑا توڑ کر منھ میں رکھ لیتے ہیں - اسی طریقے سے کھانا ترکوں میں بھی رائج ہے جو یورپ سے اختیار کیا گیا ہے یعنی کھانے میں سہولت اور اطمینان کو مدنظر رکھتے ہیں اور بہت دیر میں کھانا ختم کرتے ہیں - اور ہمارے طریقے پر نہیں کہ روٹی کے بڑے بڑے نوالے توڑ کر اور سالن میں بھگو کر منھ میں متواتر ڈالتے جاتے ہیں اور منھ کو درمیان میں بولنے کی فرصت بھی نہیں دیتے - کھانے کے بعد چائے آئی اور چونکہ میں سگریٹ پیتا تھا (عرب میں بھی سگریٹ کا پینا یعنی یشرب جارہ بولتے ہیں) اور ایران میں سیگار خوردن محاورہ ہے -) سگریٹ بھی آئے - عرب حقہ بہت کم پیتے ہیں - اور زیادہ تر سگریٹ پیتے ہیں جو وہ خود اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں - اس طرح کہ کوئی چھ انچ لانبے کاغذ کی تکلی (جو پیکٹوں کے اندر بازار میں بکتے ہیں) اور جس کو برماق بولتے ہیں - اس کے ایک سرے کو کھول کر ایک روی کاغذ کو مروڑ کر ڈال دیتے ہیں - جو کھل کر سگریٹ کا سرا بن جاتا ہے - اور دوسری طرف سے خشک دیسی تمباکو بھرتے ہیں - اور بعد کو جب سگریٹ پر ہو جاتا ہے - تو اس کا

منھ موڑ کر بند کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح عربی سگریٹ تیار ہوجاتا ہے۔ عراق کا تنبا کو اچھا ہوتا ہے اور غنیمت ہے کہ سگریٹ کے لیے عربوں کو یورپ کی فیکٹریوں کا دست نگراں ہونا نہیں پڑتا۔ جس سے ملک کی اقتصادی حالت کو ایک گونہ فائدہ ہی ہے۔ منصورہ بڑا گاؤں ہے اور بہت دور تک کھجور کے باغات ہیں۔ گاؤں کے قریب قبرستان میں ایک قبر پر گنبد ہے۔ عربوں نے بتایا کہ حضرت خضر کی قبر ہے مجھے دیکھنے کے لئے حسب معمول دیہات کی تمام عورتیں اور بچے جمع ہوگئے۔ بعض لڑکے بڑے شوخ تھے۔ اور مجھے عربی بولتے دیکھ کر بڑے خوش ہوتے تھے۔ ہندی بابا نجی مثلی (نجی عراق کا بگاڑا ہوا انجیلی ہے یعنی گفتگو کرتا ہے) مگر جتنے میرے سامنے کھڑے تھے اگرچہ کثیف تھے مگر ان میں کوئی بھی سیاہ اور نحیف بدن کا نہ تھا اور نہ کسی کی صورت سے نحافت کے آثار ہویدا تھے۔

آصف آفندی کے پاس مجھے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ اور ہر بار وہ مجھے کھانا کھلانے پر اصرار کرتے رہے۔ اکثر مجھ سے فوج کی تعداد وغیرہ کے متعلق دریافت کرتے۔ ایک بار جب مجھے پھر منصورہ جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ ہمارے دوست کو جاسوسی کے شبہے میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہوا مگر شکر ہے کہ کافی ثبوت بہم نہ پہنچنے کے سبب ان کو جلد رہا کر دیا گیا۔ میں ان سے پھر ملنے نہیں گیا اور آخری ملاقات پر انھوں نے مجھے اپنا بغداد کے پتہ کا کارڈ دیا۔

مقام سعدیہ پر کیولری کو عربی گھوڑوں کی خریداری کی ضرورت پڑی تھی۔ افسر کمانڈنگ نے مجھے بنی تمیم کے شیخ کے پاس جو اس وقت سعدیہ سے شمال خیمہ زن تھے بھیجا۔ بنی تمیم ایک قدیم اور مشہور عربی قبیلہ ہے۔ یہ عراق، صحرائے شام اور شمالی نجد میں پھیلا ہوا ہے۔

اس قبیلے کے کچھ لوگ سعدیہ کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ یہ سب بدوی ہیں حکومت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اور ان سے جو کچھ کام نکالا جاتا ہے وہ چاپلوسی اور مراعات سے۔ شیخ بنی تمیم چونکہ مشہور تھا کہ آدمی نہایت صلح پسند اور خوش مزاج ہے مجھے اپنے ہمراہ کسی سوار کو لے جانے بلکہ اسلحہ کی بھی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ میں ان سے اس حیثیت سے ملوں کہ ان کے دل میں کوئی شک پیدا نہ ہو۔ تین گھنٹے کی سواری کے بعد مجھے چند بدوی کے خیمے دریا کے پشت پر نصب دکھائی پڑے۔ پاس کچھ عرب بھیڑیں چرا رہے تھے انہوں نے پتہ دیا کہ شیخ کا قیام یہیں ہے۔ خیموں کے پاس پہنچتے ہی کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ میں نے پہلے شخص سے جو میرے سامنے آیا خواہش کی کہ میں شیخ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں۔ اس کا جواب میں نے کہا کہ میں شیخ کو دوں گا۔ وہ مجھے ان کے خیمے تک لے گیا۔ کوئی ایک درجن عرب ایک الاؤ کے گرد جس میں ایک قہوہ کی کیتلی پک رہی تھی۔ باتیں کر رہے تھے۔ اور صدر کی قالین پر ریشمی عبا میں ملبوس ایک نوجوان شخص بیٹھا ہوا تھا۔ خیمے میں داخل ہوتے ہی سب سروقد اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک آواز میں مرحبا کہا۔ نوجوان معزز عرب سے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ آدمی نہایت خوش رو اور ہنس مکھ تھا۔ کچھ ترکی جانتا تھا اور بہت کچھ فارسی سمجھتا تھا۔ میں نے عربی میں اس طرح گفتگو شروع کی اس مطلق اعیار جیش الا تکلش الی جنابکم۔ وہ معلوم نہیں پہلے لفظ کو کیا سمجھے کہ بجائے اس کے کہ وہ یہ پوچھتے کہ لاجل یا لیش۔ یعنی کیوں انہوں نے کہا کہ میں معذور ہوں۔ نحوی عربی اور عراق کی بدوی عربی میں یہ فرق ہوتا ہے۔ درمیان میں جب گھوڑے کی صفت میں یہ بتانا پڑا کہ وہ گھوڑدوڑ کے قابل ہو۔ تو میں نے کتابی عربی سبوق الخیل کہا۔

تو مجھے "کفس پرالما" یعنی جو دوڑتا ہو تو کہنے لگے "کل جیاں پر فس" یعنی
گھوڑے کی دوڑ سے ہیں۔ آخر کو انہیں سمجھانے کے لیے یعنی گھوڑ دوڑ
پورا ایکٹ کر کے دکھانا پڑا۔ سمجھا اور قہقہے مار کر ہنسا۔ بہرحال
آدمی بہت اچھا اور اپنی بدویت اور عربیت کا بہترین نمونہ تھا۔ بہت دیر تک
مجھ سے ہندوستانیوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اور اس نے مجھ سے
وہی سوال کیا جو تقریباً عراق میں بھی سرایت کر چکا تھا۔ یعنی کیا ہندوستان
کی اکثر آبادی بالکل نامرد ہے کہ وہ مٹھی بھر انگریزوں کی غلامی سے کسی
حیثیت سے رہا نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا کہ ہندوستان ایک ملک
اور ایک قوم نہیں ہے۔ اور ہر ایک کے نصب العین جدا ہیں۔ اس کے
علاوہ ہندوؤں میں قومی خودداری کی حرارت موجود ہے۔ وہ محض مسلمانوں
کی پانچواں حصہ تعداد ہے۔ ہندو عرصہ دراز تک ماتحتی کی حیثیت سے
رہ چکے ہیں کہ ان کی حالت اور یہود کی حالت ایک سی ہو گئی ہے
اور غلامی ان کی طبیعت ثانی ہے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے زوال
اور آپس کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔
بعد انھوں نے قبضہ کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستانیوں کو تمام
ذمہ داری کے عہدے اور سلاح رکھنے کے حقوق سے یک قلم برطرف
کر دیا۔ اور اب ہم اس شیر کے مانند ہیں جو ایک کٹہرے میں بند
ہے اور اس کے ناخن اکھاڑ لیے گئے ہیں۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ
میں مسلمان ہوں۔ کہنے لگے ہندوستان کا مسلمان بہت نیک اور اچھا
مسلمان ہے۔ "مسلم الہنود کلہ زین" اور پھر زین کو ہنس کر اردو
میں کہا "ٹھیک"۔ یہ ٹھیک کا لفظ اور ایک دوسرا انگریزی لفظ "فنش"
(یعنی برطرف) عراق کا عرب سمجھنے لگا ہے۔ اور بہت مزے لے کر
بولتا ہے شام تک انھوں نے مجھے نہ چھوڑا۔ اور شام کا کھانا

اپنے ساتھ کھلایا۔ کھانے میں پنیر۔ کھجور کا حلوا اور چائے تھی۔ اور جب میں چلنے لگا تو میری پیشانی کو بوسہ دے کر کہا میرے ساتھ رہو۔ میں تم کو قبائل تمیم کی سب سے عمدہ لڑکی دوں گا۔ یہ گویا ان کی بڑی اظہار محبت تھی۔

واپسی میں میں راستہ بھٹک گیا۔ کیونکہ رات ہو گئی تھی اور چاروں طرف ایک سا مسطح میدان تھا۔ جہاں کہیں روشنی نظر نہ آتی تھی۔ کوئی آدھی رات کے بعد میں پھر ایک دوسرے بدوی قبائل کے خیمے پر پہونچا۔ جس نے میری بڑی خاطر کی۔ اور رات کو اپنے خیمے میں سلایا۔ صبح تو میرے ساتھ مجھے سمیکا ریلوے اسٹیشن تک پہونچا گیا۔ جہاں سے سعدیہ قریب تھا۔ سعدیہ کے قیام میں مجھے ایک دن بغداد بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ سمیکا کا ایک زمیندار عبد اللہ جیاد کیمپ کو سبزی فروخت کرتا تھا اور اس لحاظ سے عبد اللہ جیا کی کنیت ابوالمخضر (یعنی سبزی والے یا سبزیوں کے باپ) تھی۔ اس نے مجھے بغداد کی سیر کو مدعو کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میرے ذریعے سے خود ملٹری ٹرین پر جا سکے۔ چار بجے صبح کو ٹرین کاظمین پہونچی۔ جہاں اس کا ایک ذاتی مکان تھا۔ عراق میں عموماً دیہات کے زمیندار اپنی زندگی کا ایک حصہ شہر میں بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔

کاظمین کے تیسرے گنبد کے عین اوپر کھلے آسمان پر چاند ہلالی شکل کا تھا۔ اس کے دائرے کے اندر دور پر ایک ننھا ستارہ چمک رہا تھا۔ جیاد نے اس کو دیکھ کر کہا کہ دیکھو ہمارا ستارہ و ہلال آسمان پر بلند ہے کیا اس کو بھی تم گرا سکتے ہو۔ میں نے کہا کہ اگر تمہارے ایسے فوج کو سبزی و ترکاری مہیا کرنے لگیں گے۔ تو یہ چاند و ستارہ خدا تم پر گرائے گا۔ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔ ایک دن میں اس سے وہاں کاظمین میں مہمان

مکان بہت عمدہ دو منزلہ تھا۔ مگر حد درجہ کثیف۔ خصوصاً سنڈاس کہ الاماں۔ خود عبد اللہ جیاد بھی نہایت گندگی کے ساتھ رہتا تھا یعنی صبح کو وہ اور اس کے ساتھی بلا ہاتھ منھ دھوئے سیدھے قہوہ خانے میں جاکر ناشتہ کرتے اور دن بھر پانی کا ایک چلّو وضو کے بہانے سے بھی منھ پر نہ ڈالتے اس کے ساتھ رہنے پر مجھے کاظمین کے اس تاریک پہلو پر نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ جس کے بیان کرنے کے لیے حیا و تہذیب مانع ہے۔ نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ میں خود اس میں ملوث تھا۔

الحمد للہ کہ خدا نے اس مصیبت سے بچایا ورنہ وما ابری النفسی مگر میرا عرب دوست اور اس کے رفیق نہایت آوارہ اور عیاش نکلے غضب یہ ہے کہ حسن فروشی یہاں مباح سمجھ کر ہوتی ہے۔ اور اس کا نام صیغہ یا متاع رکھا جاتا ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاظمین شریف فواحشات کا مرکز ہے۔ جب بزرگوں کے مزارات کے مجاوروں کا یہ حالت ہے تو مسلمانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ غالب نے غالباً دہلی کی جامع مسجد کے عین مقابل چاوڑی بازار کی ناپاک زندگی کو مد نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہوگا؎ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے؎

خیر۔ یا تو عبد اللہ جیاد کے مکان کی صفائی یا اس لیے کہ مجھے اوباشوں کی صحبت میں کوئی مزہ نہیں آتا۔ دوسرے ہی دن اُس سے رخصت ہوکر ارادہ کیا کہ بغداد کے کسی ہوٹل میں جاکر ٹھہروں۔ مگر اتفاق سے کاظمین میں بھی ایک یہودی تاجر میرا پرانا شناسائی مل گیا اور میں اس کا مہمان ہوگیا۔ اس یہودی کے خاندان والے یوروپین طرز کی رہایش رکھتے ہیں۔ اس کی لڑکی اور لڑکے دونوں نے انگلستان میں تعلیم پائی ہے مکان بھی نہایت مصفا اور مزین تھا۔ مجھے اپنی بیویوں اور لڑکیوں سے

انٹروڈوس کرایا۔ ہماری قوم اس اصول کی سخت مخالف ہے اور واقعی یہ معیوب بھی ہے۔ مگر میں ان سے انصاف کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ شریف عورتوں کا بے حجابانہ سوسائٹی میں آنا اس مقصد کے سوا کہ ان کا مدعا کامرانی نفس ہے اور کچھ نہیں۔ ہماری مخدرات کا پوشیدہ طور سے محض اس مقصد کے لیے اجنبی آدمی سے ملنا۔ کون زیادہ مذموم ہے رات کو اس نے میری دعوت کی تھی۔ اس میں ایک انگریز سارجنٹ بھی بہ تبدیل لباس مدعو تھا یہودی کی لڑکی کو میرے ساتھ بیٹھتے اور بات کرتے دیکھ کر اس کو میرے ساتھ کینہ ہوگیا اور آخر میں مجھ سے لڑائی ہو پڑی۔ اور نوبت بہ اینجا رسید کہ وہ چونکہ نہایت چھوٹا اور حقیر تھا اس کے علاوہ کمزور۔ خواہ مخواہ میں نے اس کی گردن ناپی۔ اور اس کو گھر سے باہر دھکا دے دیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہونے والا ہے کہ وہ لوٹ کر اپنے اور ساتھیوں کو بلا لائے گا۔ اور ایک حادثہ کی نوبت آجائے گی۔ بلا اس کا اظہار کیے ہوئے کہ میں خائف ہوں۔ میں نے اپنے میزبان سے رخصت چاہی۔ اور رات ہی کو سید صادق الین اسٹیشن پہونچا۔ خوش قسمتی سے گاڑی اس وقت سعدیہ کو چھوٹ رہی تھی اور میں اس ... روانہ ہوگیا۔ صبح کو ٹمیکا پہونچا۔ اور وہاں سے ... ریل کی پٹریوں پر چلتی ہے۔ اپنے کیمپ میں تین دن قبل رخصت بغداد کی ختم کر کے آموجود ہوا۔

(۷)

قرامطہ

(۲)

(از ایڈیٹر)

اسی زمانے کے قریب علاقہ سواد عراق میں ذکرویہ بن مہرویہ نام ایک نیا بانیٔ قرامطہ ظاہر ہوا۔ عوام میں القائم بالحق اپنا لقب مشہور کیا اور ہر طرف لوگوں کو اپنے دام میں پھنسانے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ کے اطراف میں پھر فساد برپا ہوگیا۔ والیٔ کوفہ احمد بن محمد طائی کو جب یہ خبر پہنچی تو کافی فوج لے کے حملہ آور ہوا۔ قرامطہ کو پہلی شکستوں نے اس قدر ضعیف اور خائف کر دیا تھا کہ لڑائی کے شروع ہوتے ہی ان کو سخت شکست ہوئی۔ سب منتشر ہوگئے۔ اور خود ذکرویہ بھاگ کے ریگستان عرب میں روپوش ہو رہا۔ اب اس کی یہ حالت تھی کہ برابر قبائل عرب کے پاس جاتا تھا اور پناہ مانگنے کے ساتھ انہیں اپنی طرف مدعو کرتا تھا۔ لیکن اُس کی یہ صحرا نوردی بالکل بیکار ثابت ہوئی اور کسی نے پناہ دینے کی حامی نہ بھری۔ اب ذکرویہ بن مہرویہ نے اپنی کارروائی کا طرز بدل دیا۔ لق و دق صحرا میں ایک تہ خانہ کھود کے بنایا۔ جس میں لوہے کا دروازہ قائم کیا۔ جو باہر سے بالکل ایک تنور کی وضع میں نظر آتا تھا۔ جب لوگ اس کا تجسس کرتے تو وہ کسی عورت کو بٹھلا دیتا۔ جو اس تنور میں آگ سلگا دیتی اور خود کنارے بیٹھی رہتی۔ لوگوں کو کبھی گمان بھی نہ ہوتا کہ اس جلتے ہوئے تنور کے اندر کوئی رہ سکتا ہے مگر خود ذکرویہ تارک الدنیا اہل ریاضت کی طرح تہ خانہ میں بیٹھا رہا اور اپنے تینوں بیٹوں یحییٰ حسین اور علی کو سامنے بلا کے فہمایش کی کہ تم قبیلۂ کعب بن وبرہ میں جا کے اپنے

آپ کو امام اسمٰعیل بن جعفر صادق کی نسل سے ظاہر کرو۔ اور اُن لوگوں میں پناہ گزین ہو کے اُنھیں اپنی طرف مدعو کرو۔ یہ تینوں بیٹے باپ سے جدا ہو کے قبیلۂ کعب میں پہونچے مگر خلاف امید پھرنا کامیاب رہے اور کسی قبیلہ میں اُن کو پناہ نہ ملتی تھی۔ آخر پھرتے پھرتے وہ قبیلۂ قلیص بن ضمضم میں وارد ہوئے۔ اس قبیلہ نے پناہ دی اور اُن کے نسبی دعوے کو تسلیم کر لیا۔ سب نے ۲۸۹ھ میں سرزمین سماوہ میں یحییٰ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کو یحییٰ بن عبد اللہ بن محمد بن اسمٰعیل مان لیا۔ اگرچہ لوگوں کو معلوم تھا کہ محمد بن اسمٰعیل کا کوئی بیٹا عبد اللہ نام نہ تھا مگر یحییٰ کے دعوے کو سب نے آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا۔ یحییٰ نے موقع پا کے اپنی کنیت ابو القاسم رکھی اور اپنے آپ کو تمام معتقدین میں شیخ کے لقب سے مشہور کیا۔ چند روز کے تجربہ سے جب یحییٰ کو یقین ہو گیا کہ لوگوں پر اُس کا اثر اچھی طرح پڑ گیا ہے تو اس نے اپنا پہلا نام بدل ڈالا۔ اور سب سے کہا میں نے اپنا اصلی نام ضرورۃً مخفی رکھا تھا دراصل میں محمد بن عبد اللہ ہوں۔ یہ تبدیلی اس ضرورت سے کی گئی کہ عام لوگوں کے اعتقاد میں تھا کہ امام موعود کا نام محمد بن عبد اللہ ہوگا یحییٰ نے یہ نام اپنے لیے مخصوص کر کے کوشش کی کہ خود ہی امام آخر الزماں بن جائے۔ اس نام کے بدلنے کے ساتھ ہی اس نے صاف ظاہر کر دیا کہ میں ہی امام منتظر ہوں۔ جس اونٹ پر سوار ہو کے میں نکلوں گا وہ کسا ہوا تیار کھڑا ہے اور جو میری اعانت و فرمان برداری کرے گا یقیناً فتحیاب و کامیاب ہوگا۔ اس طرح لوگوں میں ایک جوش پیدا کر کے اور اُنھیں ساتھ لے کر وہ ہر طرف گرد و نواح میں لوٹ مار کرنے لگا۔

یحییٰ بن ذکرویہ کا گروہ جب بڑھا اور جابجا قبایل پر تاخت و تاراج کی آفت نازل ہو گئی تو لوگوں میں اس کی شہرت ہوئی۔ یہاں تک

اسی ہنگام دولت عباسیہ تک خبر پہنچی کہ قرامطہ کا ایک گروہ پھر مجتمع ہوا ہے اور قریب ہے کہ وہ لوگ از سر نو ابھر پڑیں۔ معتضد باللہ عباسی کا غلام شبل فوج لے کر چڑھا کہ ان کو منتشر کر دے۔ قرامطہ نے پورے جوش و خروش سے مقابلہ کر کے شبل کو شکست دے دی۔ تب محمد بن احمد طائی نے حملہ کیا اور قرامطہ کو شکست دے دی۔ اس شکست میں محمد طائی نے قرامطہ کے ایک سرگروہ ابو الفوارس کو گرفتار کر کے دار الخلافت میں بھیج دیا۔ معتضد نے ابو الفوارس کو اپنے سامنے بلوایا اور کہا میں سنتا ہوں کہ تم لوگ کہتے ہو کہ اللہ جل شانہ کی روح اور نیز اس کے انبیا علیہم السلام کی روحیں تمہارے جسموں میں حلول کر کے تم کو لغزشوں سے بچاتی ہیں اور عمل نیک کی توفیق دیتی ہیں۔ یہ کیا سچ ہے؟" ابو الفوارس نے کہا تم کو اس سے مطلب ہی کیا ہے۔ اگر انبیا کی روحیں ہمارے جسموں میں حلول کرتی ہوں تو تمہارا کوئی فائدہ نہیں اور اگر شیطان کی روحیں حلول کرتی ہوں تو بھی کوئی نقصان نہیں۔ پھر اس کے پوچھنے سے فائدہ کیا؟ پوچھنا ہے تو وہ بات پوچھو جو تمہارے مطلب کی ہو۔ معتضد نے کہا وہ میرے مطلب کی کون سی بات ہے؟" ابو الفوارس نے کہا تو سنو جب رسول اللہ صلعم نے انتقال فرمایا تمہارے باوا عباسؓ موجود تھے نہ انھوں نے خلافت مانگی اور نہ کسی نے دی۔ ایک شخص نے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی پھر جب ابو بکرؓ نے سفر آخرت کیا تو عمرؓ کے لیے وصیت کر دی۔ حالانکہ جانتے تھے کہ عباسؓ رسول اللہ صلعم کے چچا ہیں اور زندہ موجود ہیں۔ پھر جب عمرؓ کے انتقال کا زمانہ آیا۔ انھوں نے کسی کے حق میں بیعت نہیں کی۔ اور خلافت کو چھ آدمیوں کی رائے پر چھوڑ گئے۔ اور عباسؓ کے لیے وصیت نہ کرنا کیسا انھیں اصحاب شوریٰ و عقد میں بھی شامل نہیں کیا۔ جب عباسؓ ... خلافت سے الگ کئے گئے تو تم کس منہ سے اور کس استحقاق سے مدعی ہو ... کہ عباسؓ کے مستحق ہونے پر قریب قریب کل صحابہ کا اجماع ہو گیا ...

(باقی آئندہ)

... قتل کیا گیا تھا



اسی قیام تعلیم کے دوران ایک روز میں سید احمد خاں بہادر سے ملنے کو گیا جن کی بڑی شہرت تھی۔ اور اُن کی نسبت عجیب و غریب باتیں سُن رہا تھا۔ اُن کا مدرسۃ العلوم قائم تھا جو ابھی فقط ہائی اسکول تھا۔ [illegible] کے خلاف سید صاحب کے پاس جانے کے لیے میں نے ایک سادہ کارڈ فراہم کیا۔ اور اُس پر اپنا نام اپنے ہاتھ سے لکھ کر اُن کی کوٹھی پر پہنچ کے وہ کارڈ بھیج دیا۔ فوراً مولوی مشتاق حسین صاحب جو اُن دنوں سید صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری بنے ہوئے تھے بنی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے میرے لینے کو آئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئے اور سید صاحب کے پاس ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اور اب اُن کا منہ ایسا دکھا تھا کہ گویا کبھی اس چہرے پر ہنسی آئی ہی نہ تھی۔

سید صاحب نے میرا حال پوچھا اور میں نے کہا لکھنؤ کا ایک طالب علم ہوں۔ دہلی میں مولوی نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھتا ہوں اور معقولات کی کتابیں مولوی محمد عبد الحی صاحب سے پڑھ چکا ہوں۔ سُن کر خوش ہوئے اور کہا دہلی میں جا کر مولانا نذیر حسین صاحب کو میرا سلام کہہ دینا۔ میں اُن کا احترام کرتا ہوں۔ اور قدیم سے اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہے

میں نے سلام پہونچانے کا وعدہ کر کے کہا سید صاحب آپ نے ایک مقام پر تصویروں کے رکھنے کو جائز بتایا ہے۔ میں اس کو آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ فقہی فتوی سے قطع تعلق کر کے میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح معمول ہے کہ ہر مہذب و عاقلانہ طرزِ عمل مرورِ زمانہ سے رسم بن جاتا ہے اور اس کے مصالح و اغراض فوت ہو جاتے ہیں اُسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ یہی تصویریں جو آج کسی دنیوی مقصد سے رکھی جاتی ہیں چند روز بعد پوجی نہ جانے لگیں۔ جیسا کہ گزشتہ بت پرست اقوام میں ہوتا آیا ہے۔ اس پر سید صاحب نے بڑے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور فرمایا "آیندہ زمانے میں لوگ خدا کو تو پوجتے نظر آتے نہیں تصویروں کو کون پوچھتا ہے۔" یہ جواب میرے لیے تسکین بخش تو نہ تھا مگر میں سید صاحب کی بزرگی و عظمت کے خیال سے خاموش ہو رہا۔

مولوی شبلی نعمانی مرحوم اس زمانے میں مدرستہ العلوم کے عربی مدرس مقرر ہو چکے تھے۔ اور اکثر سید صاحب کے پاس رہا کرتے۔ مجھ سے اُن سے اگرچہ راہ و رسم بعد کو بڑھا مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں لکھنؤ میں اُن کی صورت دیکھ چکا تھا۔ بلکہ مصافحہ بھی کیا تھا۔

علیگڈھ سے واپس آتے ہی میں نے میاں صاحب کی خدمت میں سید صاحب کا سلام پہونچایا۔ اور اُن کے پاس جانے کا حال بیان کیا۔ سُن کر مسکرائے۔ اور فرمانے لگے۔ "سید احمد کے باپ بھی انہیں کی ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔" پھر جب سید احمد خاں کی تکفیر کے فتوی پر ہندوستان کے اکثر علما نے مہریں کر دیں تو میاں صاحب سے ہزار کہا گیا انھوں نے مہر نہ کی۔ اور فرمایا وہ ماوّل ہیں۔ اور ماوّل کو میں کافر نہیں کہہ سکتا۔

میں نے یہاں دہلی میں اگرچہ طالب العلموں کی ایسی بے نفسی

کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اور کپڑوں کے اچھے بُرے ہونے کا کبھی خیال بھی نہ گزرتا۔ مگر دعوتوں میں جانے سے بھاگتا۔ جس سے اکثر سابقہ پڑتا اور میرے بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ دہلی والے طالب علموں کو نہایت ذلیل سمجھتے۔ اور "ملانا" کہتے ہیں جو ان کے خیال میں نہایت تحقیر کا لفظ ہے اور لکھنؤ اور دہلی میں مجھ کو یہ نمایاں فرق نظر آیا کہ لکھنؤ والے طالب علموں کی خدمت تو مطلق نہیں کرتے بلکہ بہت کم کھلاتے پلاتے ہیں لیکن ان کو ذلیل و خوار نہیں سمجھتے۔ بلکہ عزت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر دہلی میں معمول تھا کہ جن صاحب کو کبھی فاتحہ یا خیرات کی دعوت کرنا ہوتی میاں صاحب کے پاس کہلا بھیجے کہ اتنے طالب علم کھانا کھانے کو بھیج دیجئے۔ میاں صاحب اسی تعداد میں طلبہ کو نامزد کر کے بھیج دیا کرتے۔ مگر یہ لوگ جب وہاں کھانے کو جاتے تو وہ لوگ کھانا تو اچھا کھلاتے مگر کھانے کے بعد ہاتھ دھلوانا بھی اُنھیں بار ہوتا۔ اور کئی بار ایسا ہوا کہ کھانا کھا کے طلبہ یونہیں چلے آئے اور گھر میں آکر ہاتھ دھوئے۔

دعوت کرنے والوں کی یہ بدسلوکی مجھے بہت گراں گزرتی۔ اور اکثر دعوتوں میں جانے سے بچتا۔ میاں صاحب نے جو میری یہ حالت سُنی تو بہت خفا ہوئے۔ اور فرمایا "اس کا نفس بہت موٹا ہے۔ لہذا ہر دعوت میں یہ ضرور بھیجا جائے"۔ چنانچہ مجھے زبردستی ناگواری کے ساتھ جانا پڑتا۔

میاں صاحب کے طلبہ میں دو نجد کے عربی نژاد طالب علم تھے۔ ان دونوں کا نام "علی" تھا اور "علیین" یعنی دو علی کہلاتے۔ مجھ سے ان سے بہت انس ہو گیا۔ وہ مجھے آیا وہ کہا کرتے کہ اُن کے ساتھ نجد میں جاؤں۔ اور اُن میں سے بڑے علی وعدہ کرتے کہ میں اپنی ایک بھانجی کا تمھارے ساتھ نکاح کر دوں گا جو بڑی حسینہ و شکیلہ ہے۔ میں نے بتایا کہ میری بیوی موجود ہیں۔ اُنھوں نے کہا مضائقہ

کیا ہے۔ دو بیویاں کر لینا۔ میرا اُن کے ساتھ جانے کو جی تو بہت چاہتا تھا مگر ہمت نہ ہوئی۔ اور اعزہ کے تعلقات نہ چھوڑے گئے۔

چھوٹے علی کے پاس علامہ محمد بن عبدالوہاب کی "کتاب التوحید" تھی۔ میں نے دیکھا تو اس کو عقائد میں ایک نہایت ہی اچھا رسالہ پایا۔ جس میں اعتقادی مسایل پر آیات قرآنی اور صحیح احادیث سے نہایت خوبی اور صفائی کے ساتھ استدلال کیا گیا تھا۔ مولوی فضل رسول صاحب بدایونی جو غالباً اس زمانے میں زندہ موجود تھے اور اہل حدیث کے سخت ترین دشمن اور تردید کرنے والے سمجھے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کو نہایت بدنام کر رکھا تھا مولوی شاہ اسمٰعیل صاحب غازی، شہید، کی نسبت کہتے تھے کہ اُن کی کتاب تقویۃ الایمان" محمد عبدالوہاب کی کتاب التوحید" کا ترجمہ ہے جو حج کے موقع پر مولوی اسمٰعیل کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ چونکہ مجھے رسالۂ التوحید" اور تقویۃ الایمان جدا گانہ کتابیں نظر آئیں۔ اور دونوں کا بیان اور ترتیب ابواب بالکل الگ تھی لہذا یہ دیکھ کر مجھے مولوی فضل رسول کی جرأت پر حیرت ہوئی۔ میں فوراً آمادہ ہو گیا کہ رسالہ التوحید کا اپنی زبان میں ترجمہ کر ڈالوں۔ اور مولوی تلطف حسین صاحب اس کے چھاپنے کو تیار ہو گئے۔ چنانچہ میں نے ترجمہ کیا اور وہ چھپ گئی۔ اور میری یہی پہلی کتاب ہے جو شایع ہوئی۔ اور شائد دہلی میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ رسالہ التوحید کے اس نسخے کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُس پر محمد عبدالوہاب کے فرزند کی مُہر تھی۔ اور مصنف علامہ کے خاندان کی کتاب تھی۔

بعد فراغ ۱۲۹۰ھ میں لکھنؤ واپس آیا۔ مولانا محمد عبدالحی

صاحب سے ملا - جو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے - اور بعد میں جب تک زندہ رہے نہایت شفقت سے پیش آتے رہے -

سیر عراق عجم کردستان و الجزیرہ

از

(جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب)

طوبر و دستاوہ

شروع مارچ میں کیولری ڈویژن کو توڑ دیا گیا - اور ڈویژن کا لوکل پرچیز یعنی مقامی خریداری کا ڈپارٹمنٹ موقوف ہو گیا - سعدیہ سے ہمارا آفس منتقل ہو کر دریا کے دوسری جانب سعدیہ اور سندیہ کے درمیان دریا کے کنارے ایک مقام پر چلا آیا - کیونکہ اب سعدیہ میں کوئی کیمپ نہ رہا تھا - اور یہاں ہم عارضی طور سے تیرہ ڈویژن جو بالکل انگریزی فوج کا تھا سپرد کر دیئے گئے - جو دیہات میرے آفس سے سب سے قریب تھا اس کا نام طوبر تھا - اور یہاں سے ایک سڑک دستاوہ ہوتی ہوئی بعقوبہ اور خانقین کو گئی ہے طوبر کے گاؤں میں کئی بار گیا - عربوں کے جہاں دس پندرہ گھر ہو جاتے ہیں وہاں ایک قہوہ خانے کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے - یہی گویا قصبے کا کلب ہوتا ہے جہاں تمام لوکل پالٹکس پر بحث ہوتی ہے - میں نے یہاں کسی دیہات میں خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو مسجد کا وجود نہیں پایا - مسجد کی جگہ قہوہ خانے کا وجود زیادہ ضروری سمجھا جاتا ہے انگریزی فوج کی طرف سے جب کوئی اعلان شائع ہوتا ہے تو وہ قہوہ خانے

میں ہی چسپاں کیا جاتا ہے۔ طوبر کے مختصر قہوہ خانے میں بھی ایک بڑا
لمبا اشتہار عربی میں لگا ہوا تھا یہ شریف مکہ کی طرف سے تھا۔ اور
شریف کے متعلق میری یہ پہلی معلومات تھی۔ ابتک میں متعدد عربوں
سے ملا۔ اور بہت چاہا کہ شریف کی اس عجیب سیاست کے معنی پوچھوں
مگر کسی عرب کو مجھ سے زیادہ معلومات نہ تھی اور نہ کوئی شریف کی
پروا کرتا تھا۔ اس کے کاموں کو ہر شخص حتی کہ ایرانی شیعہ بھی بری
نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ اس کا بھی اعتراف تھا کہ
انجمن اتحاد و ترقی نے ان سے بدتر کام کئے ہیں۔ اور اس لیے مقابلۃً
شریف ایسا برا نہیں۔ آصف آفندی۔ مصطفیٰ نوری بک وغیرہ
ترکی نژاد عرب کے نزدیک تو شریف لایق گردن زدنی ہے وہ شریف
نہیں بلکہ شریر ہے۔ شیخ بنی تمیم۔ عبد اللہ جیاد۔ قاسم وغیرہ کے نزدیک
وہ باغی ہے اور اس کا فعل اور معاویہ اور حسینؓ کے افعال یکساں
ہیں۔ مگر کسی فریق کو عرب کے انجام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عرب
کے احیاء اور اتحاد کے خیال والے نوجوان مصری اور شامی
ہیں جن میں سے اکثر نے ترجمان کی حیثیت سے عراق میں میرا تعارف
ہو چکا تھا۔ عرب کے متعلق ان کے خیالات تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے
روسیوں کا پین اسلاو اور جرمنیوں کا پین جرمن اور خود نوجوان ترکوں
کا اتحاد توران کا خیال۔ یعنی تمام عربی بولنے والی قومیں جو ایشیا
اور افریقہ میں پھیلی ہوئی ہیں وہ متحد ہو کر آزاد قومی حیثیت
پیدا کریں۔ اور ان کے سرگروہی خدیو مصر کے زیر عنان ہو۔ ترکوں
کے متعلق ان سب کا خیال یہ تھا کہ ان کا وجود ہی عربوں کے موجودہ
انحطاط کا سبب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ترک عرصہ

دراز سے عربی علوم کو مٹانے اور اس کی جگہ ترکی علوم کو پھیلانے کے ساعی ہیں۔ اس کے متعلق میں نے ایک کتاب میں لکھا ہے۔ جو عرب اور ان کا مستقبل، کے نام سے ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ عرب کی حمایت میں ہندوستان کا ایک فائدہ یہ مضمر ہے کہ ایسی تحریک عین انگریزوں کے منشاء کے موافق اور فرانسیسیوں کے جو غاصب عرب ہیں خلاف ہے۔ اور اس کے برعکس اتحاد توران ہے جو انگریزوں کے منشاء کے خلاف اور فرانسیسیوں کے مقاصد کے موافق ہے۔ میری یہ آرزو تھی کہ ابنائے وطن اس کتاب کو مطالعہ کر کے خود اپنی رائے قائم کریں کہ ترکوں کا رجحان عرب پر اب کیا خیالی ہے اور اس کی تائید جو خود عرب و ترک نہیں کر سکتے مسلمانان ہندوستان کے دوسرے مقاصد خصوصًا ان کا ترکوں کو یونانیوں کے مکائد اور پامالی سے بچانے میں کتنا حارج ہو رہا ہے۔ اور کیا اچھا ہو کہ ایک عربی سوسائٹی کی ہندوستان میں بنیاد پڑ جائے۔ مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی کیونکہ ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ اتحاد توران پر بھی میں نے ایک کتاب "ترک اور ان کا مستقبل" کے نام سے لکھنا شروع کی تھی۔ مگر ترکی میں واقعات ایسے جلد جلد بدل رہے ہیں کہ اس کا تمام کرنا ابھی بہت قبل از وقت ہوگا۔ اسی اتحاد توران کے سلسلے میں قفقاس اور آذربائجان کے ترک جد و جہد کر رہے ہیں اور یہی خیال انور پاشا کو ترکستان لے گیا ہے۔ بالفعل ترکوں کا سب سے بڑا مدعا یونانیوں کو سمرنا اور تھریس سے خارج کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے معاملات پر غور کریں گے

اس سلسلے میں مجھے ایک بات اور لکھنا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بالکل اتہام ہے کہ عرب انگریزوں یا کسی عیسائی قوم کے ماتحت رہنے کے ترکوں کے مقابلے میں خواہشمند ہیں۔ اور جب اس سلسلے میں مجھ سے کسی عرب سے باتیں ہوئیں تو وہ فوراً نعوذ باللہ کہہ کر غصے سے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ شریف اور انگریزوں کی دوستی شریف کی اپنی ذاتی سلطنت پر مبنی ہے جس سے کسی عرب کو کچھ سروکار نہیں۔ خیر یہ مضمون اس بحث و مباحثہ کے لیے نہیں۔ معاملات عرب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کتاب مذکور پتہ میں الناظر لکھنؤ سے طلب کرکے مطالعہ کرسکتے ہیں*

طوبر سے ایک دن میں دستاوہ کی سیر کو گیا۔ دستاوہ دریا سے بہت دور ہے۔ عراق کے تمام قصبے اور شہر عموماً دریا پر واقع ہیں۔ اور دریا کے کنارے ہی شادابی بھی ہے۔ اندرون ملک میں دستاوہ ہی ایک ایسا مقام ہے جو آباد و شاداب ہے۔ عراق میں بہار کا موسم مارچ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور دستاوہ کے باغات جب میں نے دیکھے تھے مجھے عراق میں سب سے زیادہ سرسبز و شاداب و تروتازہ نظر آئے تھے۔ قصبہ بھی خاصہ بڑا ہے۔ مکانات اور بازار اچھے سلیقے سے بنے ہوئے ہیں۔ بیچ قصبہ میں ایک بڑی عمارت حکومت کا مرکز ہے۔ دستاوہ میں ایک عرب عیسائی کیمپ سے تعلقات ہونے کی وجہ سے میرے شناساؤں میں تھا۔ میں اس کے مکان پر گیا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک جوان بظاہر مسلمان عرب عورت نے دروازہ کھولا۔ ترکوں کے زمانے میں عراق کے عرب اگر یہ سُن پاویں کہ کسی یہودی یا

* واضح رہے کہ سید صاحب نے یہ مضمون سنہ ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا۔ (ایڈیٹر)

عیسائی کے گھر میں مسلمان عورت ہے تو فوراً ان دونوں کا خاتمہ ہو جائے مگر انگریزوں کے قدم کی برکت سے اس نئی بدعت کی بھی ابتدا ہوگئی ہے۔ عیسائی سے میں نے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے۔ کیا تمھاری منکوحہ ہے۔ اس نے کہا نہیں یوں ہی رکھ چھوڑی ہے۔ میں نے کہا لاوارث ہے یا ان کا کوئی رشتہ دار ہے۔ کہا نہیں اس کا شوہر ہے۔ سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور۔ تو عرب بدکار ہی نہیں بلکہ بے حیا اور دیوث بھی ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اعوذ بلکَ من فقر الذی سواد الوجہ فی الدارین۔ افلاس نے مسلمانوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔ یقیناً ہمارے ہندوستان کے خیالات عربوں کے متعلق بہت کچھ قابل ترمیم ہیں۔ خدا کرے کہ ایسی مثالیں کم ہوں کم سے کم میری آنکھیں نہ دیکھیں اور میرے کان نہ سنیں۔

طوبہ کے قیام میں میری طبیعت گوروں سے سخت منغص ہوگئی۔ میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ہندوستانی کو انگریزی کیمپ کے اندر وہی درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو ٹرانسپورٹ لاین میں خچروں اور گھوڑوں کو۔ بلکہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ بدتر ہے میرا جو کچھ بھی برائے نام رینک تھا اس نے اتنا تو غنیمت تھا کہ گوروں کو ڈیم فول کہنے کی جرأت نہ پڑتی۔ ورنہ اور صورت میں میں اپنے ہم وطنوں کی عام حالت سے کچھ ہی بہتر تھا۔ تیرہ ڈویژن جس کو تمام تر گوروں کی فوج ہونے کی وجہ سے فخر و مباہات سے لائن ڈویژن یعنی شیروں کا ڈویژن کہا جاتا ہے۔ اس میں صرف میں ہی ایک ہندوستانی تھا۔ اور ہمارے ساتھ ایک سارجنٹ کلرک بھی شریک تھا۔ سارجنٹ کو کوئی نوکر رکھنے کا مجاز نہیں۔ ترجمان کے لیے گھوڑا سائیس اور نوکر بھی ملتا ہے۔ یہ بات اس کو نہ بھائی کہ ایک ذلیل ہندوستانی اس سازو سامان کے ساتھ رہے۔ اور وہ اپنا کام خود کرے۔ آخر کو

اس نے افسر سے کہہ سن کر نوکر کو جو کیمپ فالور تھا اور ہندو تھا ہم دونوں میں شریک کر لیا۔ پہلے یہ میرا کھانا پکایا کرتا تھا۔ اور چونکہ یہ برہمن تھا میں نے اس کو کبھی گوشت پکانے کی تکلیف نہیں دی اب غریب پر یہ مصیبت آ پڑی کہ سارجنٹ صاحب کا بیف اور بیکن (سور کا گوشت) بھی پکانا پڑتا۔ بہت رویا چلایا۔ اپنے دھرم بگڑنے پر ہاتھ پیر مارے مگر کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ آخر کو میں نے خود افسر سے اکیلے میں کہا کہ ہندو گائے کے گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے اور پکانا کیا معنی۔ میرا یہ کہنا غضب ہو گیا۔ اب سارجنٹ اور افسر دونوں نے یہ سمجھا کہ میں بڑا ایجی ٹیٹر (فتنہ پرداز) ہوں اور میں ہی اس کو بھڑکاتا ہوں۔ چونکہ تیرہ ڈویژن تمام تر تازہ ولایت تھی اور کوئی ہندوستانیوں کے قاعدے سے واقف نہ تھا۔ میں کیا سمجھاتا عجب مخمصہ میں تھا۔ بالآخر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں استعفا دے دوں اور اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنا تبادلہ کسی اور ڈویژن سے کرا لوں یا اپنی رجمنٹ میں واپس چلا جاؤں۔ استعفا میرا منظور نہیں ہوا مگر دوسرا معاملہ آسانی سے طے ہو گیا۔ ایک بڈھا ریشا کیل بغدادی یہودی جو چودہ برس جنوبی افریقہ میں فورچون (دولت) کی تلاش میں خستہ سرگردانی کرتا تھا اور اب بغداد میں بھوکوں مر رہا تھا۔ بھاگتا ہوا آن پہونچا۔ انگریزی اور فرنچ زبان میں خاص مہارت تھی۔ اور مجھے اسی روز ایسا ہوا کہ اپنا بوریہ بستر باندھ ایران سدھاروں۔ فارسی مجھے عربی سے اچھی آتی تھی۔ اور یہ اچھا ہوا کہ پھر مجھے شیخ نیم کی طرح ناقدروں کو گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کی صفت بیان کرنے بجز خود گھوڑا بننا نہ پڑے گا۔ شاید ایران میں فارسی ترجمان کی ضرورت زیادہ تھی مگر حکم ملتے ہی بصرہ کے

ڈائرکٹر لوکل پرچیز نے اپنی خاص موٹر بھی بھجوادی اور میں خوش خوش یہاں سے رخصت ہوگیا ؎ بہت بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے
معلوم نہیں اس غریب ہندو فالور پر اس کے بعد کیا بنی۔ بے چارہ بہت نیک، بریلی کا رہنے والا اپنے کو پانڈے کہتا تھا اور میری بڑی خدمت کی تھی۔ میں نام نہ بتاؤں گا تاکہ اس کو کوئی پہچان نہ سکے اور جب وہ ہندوستان آئے تو برادری والے اسے ذات باہر کردیں۔

بعقوبہ، قزل رباط و خانقین

دستاوہ کے راستے سے میں موٹر پر بعقوبہ کو روانہ ہوا۔ موٹر میں علاوہ انگریزی ڈرائیور کے دو اور دیسی جنٹلمین میرے ہمسفر تھے۔ انھوں نے اپنا تعارف مجھ سے اس طرح کرایا کہ وہ لوکل پرچیز کے گماشتہ یعنی ایجنٹ تھے۔ ایک نے اپنا نام کسپر خاں بتایا۔ دوسرے کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ کسپر خاں جیسا نام سے ظاہر ہے اگرچہ خاں کا عجیب لفظ شامل تھا۔ مسلمان نہ تھا بلکہ اسور کی عیسائی اور ایران کی رعیت۔ ایران میں غیر مسلم مسلمانوں کے اثر سے اپنے نام کے ساتھ خاں۔ مرزا کا لقب فخریہ لگاتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ملک میں انگریز پرست اصحاب مسٹر اور کبھی کبھی انگریزی حروف تہجی میں اپنا اصلی نام اور اپنی قوم و ذات کو واضح طور سے ظاہر کر کے چھوٹے نام کے استعمال کرتے ہیں۔ کسپر خاں آدمی سن رسیدہ جہاں دیدہ ہے اور ممکن ہے کہ اس کا یہ کہنا صحیح ہو کہ وہ والی پشت کوہ کا بغداد میں نمائندہ بھی رہا ہے۔ تنخواہ معقول ملتی ہے یعنی کوئی تین چار سو روپیہ کے قریب۔ اور جب اس نے یہ کہا کہ وہ

موٹر میں دستاوہ کو بھوہ و غلے کی خریداری کی نیت سے بھیجا گیا ہے تو مجھے اپنے زعم تفاخر کو کہ یہ موٹر کار میرے لیے مخصوص آئی تھی ترمیم کرنا پڑا۔

دستاوہ سے بعقوبہ تک موٹر میں کوئی تین گھنٹے صرف ہوئے۔ تمام راستہ بالکل خشک۔ بیابان۔ اور غیرآباد تھا اور بعقوبہ سے تھوڑی دور پر موٹر ڈرائیور راستہ بھی بھول گیا۔ بہت دیر تک چکر کھا کر آخر کو غروب آفتاب کے وقت دیالہ کی سڑک مل گئی۔ اور اس کے بعد دیالہ کے پختہ پل کو پار کرکے ہم بعقوبہ میں داخل ہوئے۔ بعقوبہ میں دور تک گنجان کھجوروں کا جنگل ہے۔ اور اس کی شادابی کسی طرح بصرے سے کم نہیں۔ پل کے پار تھوڑی دور شہر کے اندر ایک بڑے مکان میں جس کے چاروں طرف باغ ہیں اور اس پر شام کے وقت پرندوں کی نہایت سہانی آواز عجب لطف پیدا کر رہی تھی ہماری موٹر رکی۔ میرے اترنے کے ساتھ ہی ڈائرکٹر لوکل پرچیز سے ملاقات ہوئی۔ اور اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ تم کو قصر شیریں میں جانا ہوگا۔ بالفعل ہمارے آفس کے کلارک تمہاری رہائش کا انتظام کر دیں گے۔ آفس کا ہیڈ کلارک ایک کرانی تھا اور الہ آباد کا رہنے والا۔ ہم وطنی کے سبب سے میری بڑی خاطر کی۔ جس مکان میں کلارک رہتے ہیں اسی میں آفس ہے اور سارا مکان بہت بڑا اور عمدہ طرز پر بنا ہوا ہے دروازے سے داخل ہونے کے بعد صحن تھا جس میں ایک کنواں تھا اوپر بالا خانے پر آفس اور کلارکوں کی رہائش کے کمرے تھے جس میں ایک کمرہ مجھے رہنے کو ملا۔ رات کو گرمی پڑتی تھی اور میں اور میرے کلارک سب چھت پر سوتے۔ ہمارے ہمسائے بلکہ زیر سایہ

عرب تھے اور جس چھت پر ہم سوئے تھے وہ چھت ان کے مکانوں سے بلند ہونے کی وجہ سے ان کے گھر کا سامنا پڑتا تھا۔ اگرچہ قوم عرب کو پردہ داری کا انتہا خیال نہیں تاہم کلرکوں نے بتایا کہ عربوں کو ہمارا چھت پر سونا ناگوار ہوتا ہے اور افسر نے ہدایت کردی ہے کہ کوئی شخص ان مکانوں میں قصداً نہ جھانکے

صبح دوسرے روز میں یعقوبہ دیکھنے گیا۔ ایک مسقف بازار جو اندازاً آدھ میل لانبا ہوگا آفس سے دس قدم کی دوری پر ہے۔ اور جا بجا کھلی جگہوں میں قہوہ خانے ہیں۔ جس میں ہر وقت آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ شہر میں ہر طرف صفائی تھی اور بازار کے باہر کئی سڑکیں چوڑی اور پختہ بنی ہوئی ہیں یعقوبہ میں ہر طرف نہریں بہتی ہیں۔ اور کنارے میوہ دار درختوں کا سایہ ان کی قطار شام کی گل گشت کے لیے بہت موزوں ہے۔ یعقوبہ خاص کر عمدہ سنتروں کے لیے مشہور ہے اور دور دور تک اس کے باغ چلے گئے ہیں۔

مضافات یعقوبہ میں کئی ایک دیہات ہیں جہاں دیہاتی عرب کاشتکاری میں مشغول ہیں ایک نہر کے اوپر پختہ پل تھا جو غالباً حال ہی میں تیار کرایا گیا ہے۔ مگر پل پر ترکی میں بنانے والے گورنر خلیل پاشا کا نام کندہ ہے۔ یعقوبہ میں زیادہ تر آبادی عربوں کی ہے۔ مگر عجم۔ یہود اور نصارا بھی کم نہیں میرا ایک مصری عیسائی دوست یہاں حکومت سیاسی میں ترجمان تھا۔ شام کو اس کے مکان پر ملنے گیا۔ اس کے مکان پر بھی دو جوان عرب عورتیں خادمہ کی حیثیت سے نظر آئیں۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اپنے قبلی دوست سے اس کے متعلق استفسار کروں مگر کلرکوں نے مجھ سے بتایا کہ خود ان میں سے ہر ایک کے پاس اس طرح ایک ایک داشتہ ہے۔ عربوں کی اصل زندگی کا پہلو جب اس پہلو نظر رکھی جاسکے کہ ایک کثیر آبادی خراب و فحشیات سے پرہیز نہیں کرتی واقعی بہت تاریک ہے اگرچہ میں پھر بھی اس کا اعتراف کروں گا

کہ ایسی عورتیں مخصوص درجے کی ہیں جو ضرورتاً اس ذلیل پیشے کو روا رکھتی ہیں۔ اور چونکہ انگریزوں سے پہلے یہاں رنڈیاں پبلک میں نہ آسکتی تھیں وہ ایسے ہی خفیہ طور سے ناجائز طریقے اختیار کرنے پر مجبور تھیں۔ مگر پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ اب جبکہ ان کو پوری آزادی ہے۔ یہ عورتیں کس قسم کی ہیں۔ جو ہماری مقیم فوج کے سپاہیوں حتی کہ ذلیل ترین غالوروں کے پاس بھی دیکھی جاتی ہیں۔ بعضوں نے برائے نام نکاح بھی کر لیا ہے اور میں نے سنا ہے کہ تھوڑا عرصہ ہوا ایک مہتر یعنی بھنگی نے بھی یہی جرأت کی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بازاری عورتوں میں شامل نہیں اور ان کے وجود کا سبب ترکوں کی ایام جنگ میں عام دست درازی اور آبادی کو حد سے زیادہ مفلوک بنانے کا نتیجہ ہے۔ اور چونکہ آبادی کا ایک طبقہ شیعیت کی طرف مائل ہونے سے متعہ کی نکاح کو جائز جانتا ہے۔ بھوکی اور لاچار عورتیں اور وہ بھی اس درجہ کی ہیں جن میں تمیز کی قوت بہت کم ہوتی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ ایسے وسیلے اختیار نہ کریں جو ان کے نزدیک ان کو بھوک سے بچا لینے کے ساتھ حرام ہونا جائز بھی نہیں ہے۔ پس ان کی پستی کا باعث سوائے خود اسلامی قوم کے کوئی نہیں

میں یعقوبہ میں ایک ہفتہ سے زیادہ ٹھہرا۔ ان دنوں میں ایک رات عربوں نے چراغاں کیا تھا۔ پہلے مجھے خیال ہوا کہ انگریزوں کی ایما سے کسی فتح کی خوشی میں ایسا ہوا ہوگا۔ مگر ایک عرب نے بتایا کہ یہ مسلمانوں کا ایک تہوار ہے۔ جس کو یہاں منایا کرتے ہیں۔ شاید ہمارے یہاں کی شبرات کے مرادف ہو۔ یعقوبہ سے روانہ ہونے پر مجھے جبل حمرین کے دامن تک ملٹری ریلوے پر سفر کرنے کا موقع ملا جو یہاں سے تقریباً چالیس میل دور ہے یہی ریلوے تھا ابتدا خانقین تک بلکہ کفری اور کرکوک ہوتی ہوئی موصل تک بھی جائے گی۔ بالفعل جبل حمرین کے

دامن میں ایک مقام رومن تک جس کو انگریز ٹیبل ماؤنٹ اسٹیشن کہتے ہیں بن چکی ہے۔ رات کو دس بجے کے قریب میں یعقوبہ ریلوے اسٹیشن سے جو شہر سے دو میل دور ہے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ علاوہ میرے ذاتی سامان کے دو نہایت وزنی اسکیل جو ہر ایک دو دو من کا تھا ساتھ کر دیا گیا کہ ایک خانقین کے لوکل ہیڈ ڈپارٹمنٹ کو حوالہ کر دوں اور ایک اپنے ساتھ قصر شیریں لیتا جاؤں۔ گاڑی پہ میرا سامان خود انگریز موٹر ڈرائیور نے جو مجھے پہنچانے آیا تھا رکھ دیا۔ اور اگرچہ قد کا نہایت چھوٹا تھا مگر ایسے وزنی اسکیلوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر بلا تکلف گاڑی پہ رکھ دیا۔ جب میں نے اس کی قوت کی تعریف کی تو کہا کہ میں لنڈن میں دس برس سے کئی من کوئلہ اپنی پیٹھ پہ لاد کر اٹھاتا تھا۔ تقریباً تین بجے صبح کو ہم رومن اسٹیشن پہ پہنچے۔ راستے میں شہربان کا ایک بڑا گھر پڑا تھا۔ یہ شہربان میرا خیال ہے کہ حضرت شہربانو کے نام سے مشہور ہے اور دیالہ کی وادی میں یعقوبہ اور خانقین کے بعد بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میں نے رات کو اس کو اچھی طرح سے نہ دیکھا۔ رومن اسٹیشن پہ گاڑی پہنچتے ہی کسٹم کے کردی اور عربی قلیوں نے ایک دم ہجوم کر دیا اور مجھے موقع نہ ملا کہ اپنی چیزیں کسی سے اتروا کر ایک طرف رکھوا دوں بالآخر چونکہ میں جانتا تھا کہ تمام سامان اتار کر زمین پہ رکھا جائے گا صرف اپنا ہینڈ بیگ (جھولی) اور اوورکوٹ لے کر اتر آیا۔ اور باقی سامان کردوں اور عربوں کے شور و شغب میں سپردم بتو مایۂ خویش را اگرچہ ابھی صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے اور میں نے چاہا کہ پلیٹ فارم پہ اوورکوٹ بچھا کر سو رہوں مگر نہ مچھروں اور نہ کردوں نے مجھے اس بات کا موقع دیا۔ خوش قسمتی سے صبح کو معلوم ہوا کہ اس سپلائی ڈپو کا تعلق چودہ ڈویژن سے ہے جس میں میں سینٹ ایلطار کے زمانے میں

ہے تو اعلیٰ طبقہ لوہے کی یوروپین کوچ استعمال کرتا ہے اور ادنیٰ طبقے اکثر کھجور کی شاخوں کا تخت بناتے ہیں جس کو یہاں سریر بولتے ہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر مجھے بہت آرام ملا۔ قزل رباط سے دوسری صبح روانہ ہو کر دن کو دس بجے خانقین پہنچا۔ خانقین اور قزل رباط کے درمیان ویسے ہی [illegible] میدان ہے۔ خانقین دریائے الوان پر آباد ہے اور یہاں کافی بستی ہے اور قزل رباط کی طرح شہر کے چاروں طرف گنجان کھجوروں کے باغات ہیں۔ الوان دریا پر ایک پتھر کا [illegible] بنا ہوا ہے جس پر سے ہو کر سڑک گذرتی ہے۔ اس سے گزر کر ہم خانقین شہر میں داخل ہوئے شہر متوسط درجے کا ہے اور ہماری سڑک پر مکانات پختہ اور خوبصورت بنے ہوئے ہیں ایک طرف ایک خبازد یا باورچی کی دکان سے دھواں نکل رہا تھا اور چند [illegible] سے نان بائیوں کی طرح کثیف تھی ایک جگہ صبح سے کتاب بیچتے [illegible] تھے۔ دوسری طرف قہوہ خانوں میں لوگ اس طرح جمع تھے جیسے کسی [illegible] جلسے میں جمع ہوں۔ شہر کے آخری مکان میں لوکل ہیڈکوارٹر تھا۔ جہاں مجھے ایک دوسری اسکیل حوالے کرنا تھا اور قصر شیریں تک کے لیے انتظام سواری کا کرنا تھا۔ جس مکان میں لوکل ہیڈکوارٹر کا آفس ہے اسی کے قریب ایک دوسرے مکان میں پہلا ڈپو ہے اور یہ دونوں مکانات ترکوں کے زمانے میں تحصیل خانے تھے۔ تحصیل خانے وہی چیز ہے جو انگلینڈ اور یوروپ میں ورک ہاؤس کہلاتی ہیں۔ جہاں غریب اور اپاہج آدمی کو گورنمنٹ سے کام اور روزینہ ملتا ہے۔ رات میں نے تحصیل خانے کے دفتر میں کاٹی اور بڑا لمبا چوڑا مکان بلا روشنی کے ہُو کا عالم ہوتا تھا اور ایک لڑکے نے مجھ سے بتایا تھا کہ رات کو یہاں بھوتوں کا پہرہ رہتا ہے۔ رات کو جہاں ذرا کھٹکا ہوتا۔ میری آنکھ کھل جاتی اور میں سمجھتا کہ بھوت آگئے۔

خانقین کے لوگ یا تو ترکی نژاد ہیں۔ یا ترکی حکومت کا اثر ہے کہ

تقریباً تین چوتھائی آبادی ترکی زبان میں بات چیت کرتی ہے مگر کوئی شخص ایسا نہیں جو ترکی کے ساتھ فارسی عربی اور کردی نہ جانتا ہو۔ اس لحاظ سے خانقین ایک عجیب شہر ہے۔ جہاں کا ہر بچہ چار زبانوں میں گفتگو کر سکتا ہے۔ شام کے وقت میرے سامنے سے ایک جنازہ نکلا جس کے آگے لوگ باجا بجا رہے تھے لوگوں نے بتایا کہ یہودیوں کے جنازے کے ساتھ ہمیشہ باجا بجایا جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ہمارے یہاں ہندوؤں کا دستور ہے۔

دوسری صبح ہم خانقین سے پھر موٹر پر روانہ ہوئے۔ یہاں سے بارہ میل پر قلعہ سبزی ایک مقام ہے سرحد ایران شروع ہو جاتی ہے۔ اور جہاں سے سرحد کی ابتدا ہوتی ہے وہاں ایک اونچا برج بنا ہوا ہے۔ خانقین سے قصر شیریں کا راستہ ناہموار خشک پہاڑیوں کا ہے۔ جس میں سڑک بہت چکر کھا کر جاتی ہے۔ سامنے دور پر ایران کے اونچے اونچے پہاڑ نظر آ رہے تھے مگر ہمارے چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ کہیں ایک درخت کا پتہ نہ لگتا تھا۔ کوئی دوپہر کو ہم قصر شیریں پہونچے۔ اور ہماری سڑک اس ویرانے سے ہوتی ہوئی گزر رہی۔ جو شیریں کے محل کے پرانے آثارات میں سے ہے۔ قصر شیریں کی موجودہ آبادی ہمارے داہنے ہاتھ دریائے حلوان کے کنارے نیچے پہاڑیوں کے دامن میں چھپی ہوئی تھی۔ قصر شیریں کے آثار قدیمہ سے گزر کر ہماری گاڑی داہنی طرف کو مڑی اور ایک ڈھلوان پہاڑی پر چڑھ کر ہم قصبے میں داخل ہو گئے پہلی عمارت ایک پرانی بارک کی طرح بنی ہوئی تھی اور یہی ہمارا منزل مقصود تھا۔ جہاں ہم بالآخر طویل سے دس روز کے سفر کے بعد پہونچ گئے۔

(باقی آئندہ)

قرامطہ

(۳)

(از اڈیٹر)

قرامطہ کو اگرچہ علاقہ سواد میں سخت شکست ہوگئی مگر ان کی قوت بالکل ٹوٹ نہیں گئی تھی۔ اس شکست کے بعد ہی یحییٰ پھر اپنی کامیابی کی تدابیر میں مصروف ہوا۔ اب اُس نے اپنے حملوں کا نشانہ دمشق کو بنایا اس لیے کہ گزشتہ شکست سے اُسے اس بات کا یقین کامل ہوگیا کہ علاقۂ سواد، عراق اور کوفہ پر اب کامیابی کی امید نہیں۔ دمشق پر ان دنوں ابن طولون حاکم مصر کا غلام طغج حکمران تھا۔ اُس نے جب قرامطہ کا یہ جوش وخروش دیکھا تو دل میں نہایت خائف ہوا۔ اور مصر سے کمک طلب کی۔ اس کمک کے آجانے پر طغج نے قرامطہ سے مقابلہ شروع کردیا۔ مختلف لڑائیاں ہوئیں اور آخرکار قرامطہ کو بُری طرح شکست ہوئی۔ خود یحییٰ جو امام موعود بن گیا تھا مارا گیا اور اُس کے مرید جا بجا منتشر ہوگئے۔

مفرورین میں سے جو لوگ صاحب اثر تھے اُنھوں نے باہم جمع ہوکے یحییٰ کے بھائی حسین کو اپنا مقتدا بنایا۔ اُس نے اپنا لقب احمد مقرر کیا۔ ابوالعباس کنیت قرار دی اور صحرائی عربوں کو پھر اپنی طرف مدعو کرنے لگا۔ بہت سے قبائل وگروہ اُس کے گرد جمع ہوگئے اور یحییٰ سے بھی زیادہ شوکت وحشمت اس کو حاصل ہوگئی۔ جب اُس نے اپنے معتقدین کو اپنے چہرے کا ایک شامہ (داغ) دکھلا کے کہا یہ علامت حق ہے جو خدا کی طرف سے مجھے مرحمت ہوئی ہے۔ اسی وقت سے یہ شخص صاحب شامہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

الغرض صاحب شامہ نے پوری قوت حاصل کر کے قرمطی سیلاب کو پھر دمشق کی طرف بڑھایا۔ اب اہل دمشق میں اتنی قوت نہ تھی کہ اپنی حفاظت و حمایت کر سکیں آخر دمشقیوں نے امان مانگی۔ اور ادائے خراج کے وعدے پر صلح کر لی۔

اس کے بعد صاحب شامہ دمشق چھوڑ کے شہر حمص کی دیواروں کے نیچے پہونچا۔ حمص کو اس نے فوراً فتح کر لیا۔ اور وہاں کے منبروں پر اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور اسی وقت سے اس نے اپنا نام المہدی امیرالمومنین مقرر کیا۔ اسی زمانے میں صاحب شامہ کا ایک عم زاد بھائی اس سے آ کے ملا تو اس کو اس نے اپنا جانشین مقرر کیا اور اُسے "مدثر" کا خطاب دیا اور کہا یہ وہ مدثر ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ پھر اپنے ایک غلام کو "مطوق" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اور اس کے ذمے یہ خدمت سپرد کی گئی کہ گرفتار شدہ مسلمانوں کو قتل کیا کرے۔ گویا اہل اسلام کی جلادی اس کے سپرد تھی۔ حمص کے بعد صاحب شامہ شام کے بلاد حماۃ اور معرۃ النعمان پر حملہ آور ہوا۔ ان شہروں میں اس کی فوج نے ایک خلقت عظیم کو قتل کیا جس میں مرد عورت بچے سب شامل تھے۔ پھر اس نے شہر بعلبک پر حملہ کیا اور وہاں کے قریب کل باشندوں کو قتل کر ڈالا اس کے بعد شہر سلمیہ پر پہونچا۔ یہاں کے لوگوں نے پہلے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کی قوت کو دیکھ کر آخر سب نے اطاعت کی درخواست کی۔ صاحب شامہ نے ان کی درخواست منظور کر کے شہر کے پھاٹک کھلوا لیے اور اندر داخل ہوتے ہی قتل عام کا حکم دے دیا اور [illegible] کہ بادشاہ [illegible] اپنے آپ کو بنی فاطمہ کا نقیب بتاتا تھا اور [illegible] فاطمی ہونے کا [illegible] تھا یہاں قتل عام میں بنی ہاشم ہی سب سے پیشتر

کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ قرامطہ کو سلمیہ میں جب آدمی نہ ملے تو ان کی بے روک تلواریں جانوروں پر جھک پڑیں اور بہت سے جانور بھی قتل کر ڈالے گئے۔ ان ناخدا ترس ظالموں نے مکتبوں اور مدرسوں میں گھس گھس کے معصوم بچوں تک کو قتل کر ڈالا۔ جب شامہ نے دیکھا کہ سلمیہ میں اب کوئی متنفس نہیں نظر آتا۔ تو اس نے حکم دیا کہ اطراف و جوانب میں جو گاؤں ہوں ان میں بھی قتل کیا جائے۔

جب یہ نوبت پہنچ گئی تو سرزمین شام میں ہر طرف ہاہاکار مچ گئی۔ ہر گاؤں ہر محلہ ہر گھر سے آہ و واویلا کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز جب دار الخلافت بغداد تک پہونچی تو خلیفہ المکتفی باللہ مرکز ہی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے مستقل ارادہ کر لیا کہ جس طرح ہو سکے قرامطہ کا استیصال کر دے۔ اس نے اپنی فوجوں کو بڑھا کے قرامطہ سے مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی۔ قرامطہ بھاگ کے حلب میں پہونچے۔ المکتفی تو پہلے شکست دے کے رقہ میں واپس آگیا اور حاکم مصر ابن طولون کا غلام بدر فوج لے کے قرامطہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے مکتفی نے یحییٰ بن سلیمان کاتب کو روانہ کیا جس کے ساتھ بنو شیبان کا ایک بڑا گروہ تھا اور حسین بن حمدان تغلبی بھی موجود تھا۔ ان لوگوں نے جا کے ۲۹۱ھ میں قرامطہ کو بڑی فاش شکست دے دی۔ ان کا ایک بہت بڑا گروہ قتل ہو گیا خود صاحب شامہ اپنے خلیفہ مدثر اور اپنے غلام مطوق کے ساتھ منہ چھپا کے کوفہ کی طرف بھاگا۔ مقام رحبہ تک پہونچے تھے کہ لوگوں نے ان کو پہچان لیا اور وہاں کے حاکم کو خبر کر دی۔ اس نے فوراً ماخوذ کر کے مکتفی کے دربار میں بھیج دیا۔ وہاں مکتفی کے حکم سے پہلے صاحب شامہ کو دو سو کوڑے مارے گئے اور اس کے بعد تینوں تلواروں سے کاٹ ڈالے گئے۔

[ذکرو]یہ کا تیسرا بیٹا علی رہ گیا تھا۔ وہ ابتداً یحییٰ کے ہمراہ تھا لیکن جب یحییٰ دمشق میں مارا گیا تو اُس نے صاحب شامہ کا ساتھ نہ دیا بلکہ بھاگ کے بلاد سواحل فرات میں بیٹھ رہا۔ یہاں بھی کچھ قرامطہ اُس کے ہمراہ ہو گئے اور موقع پا کے اُس نے طبریہ پر تاخت کی اور اہل طبریہ کے لیے اُس نے ظلم و جور نہیں اُٹھا رکھا۔ پھر جب حسین بن حمدان قرامطہ کے تعاقب میں روانہ ہوا تو علی بن ذکرویہ نے بھاگ کے یمن میں پناہ لی۔ وہاں بھی بہت سے داعیین قرامطہ اُس کے ہمراہ ہو گئے جن سے قوت حاصل کر کے وہ اکثر بلاد یمن پر متصرف ہو گیا دیگر اطراف و جوانب میں جب اس کی دھاک بیٹھ گئی تو یمن کے مستقر شہر صنعا کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی خبر حاکم یمن ابن یعفر کو پہونچی تو صنعا چھوڑ کے بھاگ گیا۔ علی نے صنعا میں داخل ہو کے ہر طرح کی زیادتی اور خون ریزی وہاں جائز کر دی۔ اُس کے چند روز بعد وہ اطراف یمن ہی میں مرگیا۔

جس زمانے میں علی بن ذکرویہ یمن پر تصرف حاصل کر رہا تھا۔ اُسی زمانے میں دوسری طرف خود ذکرویہ نے جب یہ دیکھا کہ اہل سماوہ میں سکوت پیدا ہو گیا ہے اور افواج خلافت سے شکستیں کھا کے اُنھوں نے بالکل خاموشی اختیار کر لی ہے تو اپنے خاص مریدوں میں سے عبداللہ بن سعید ایک شخص کو ۲۹۳ھ میں ایک خط دے کے ان کے پاس روانہ کیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ مجھے بذریعہ وحی یہ معلوم ہوا ہے کہ صاحب شامہ اور اس کے بھائی شیخ یحییٰ دونوں آیا چاہتے ہیں اور ان دونوں کے بعد خود امام علیہ السلام ظہور فرمائیں گے جن کے برآمد ہوتے ہی ساری دنیا میں عدل و انصاف جاری ہو جائے گا۔ عبداللہ اس خط کو لے کے [illegible] گیا۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور اُس نے اپنے زیرِ علم کافی قوت پا کے بلاد شام کی طرف توجہ کی۔ اور دمشق کی

دیواروں کے نیچے جا کے مقیم ہو گیا۔ چند روز کی لڑائی کے بعد دمشق پر قرامطہ کا قبضہ ہو گیا۔ خلیفہ المکتفی باللہ نے قرامطہ کی سرکوبی کے لیے پھر فوجیں روانہ کیں جس نے قرامطہ کو ان اطراف سے بھگا کے منتشر کر دیا۔

اب ذکرویہ کے تمام بیٹوں کا خاتمہ ہو چکا اور وہ تدبیریں بھی تمام ہو گئیں جو ذکرویہ اپنے گھر سے بیٹھے بیٹھے عمل میں لا سکتا تھا مجبوراً سرگروہان قرامطہ اُس کے گرد جمع ہوئے اور اُسے اُس تہ خانے سے نکال لائے جہاں وہ بیس برس سے خلوت گزین تھا۔ تمام داعیان قرامطہ اس موقع پر جمع تھے ذکرویہ بن مہرویہ نے اپنی صورت کسی کو نہیں دکھائی اور احمد بن قاسم کو اپنی طرف سے سب پر حکمران اور اپنا نائب مقرر کیا۔ ذکرویہ نے سب لوگوں کو تاکیدی حکم دیا کہ ابن قاسم کی پوری پوری اطاعت کریں۔ اس طرح قرامطہ کا ایک نیا لشکر مرتب ہو کر چلا۔ خود ذکرویہ بھی ہمراہ تھا مگر اسی شان سے کہ کسی کو اپنی صورت نہ دکھاتا تھا۔ اور احمد بن قاسم اُس کی طرف سے کل انتظامات کرتا تھا۔ جب یہ خبر مکتفی کو پہنچی تو اُس نے ان کے مقابلے کے لیے پھر فوج روانہ کی۔ علاقہ سواد عراق میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ مگر افواج خلافت کو شکست ہوئی۔ قرامطہ نے خلافت کے لشکر کا کل ساز و سامان لوٹ لیا۔ اور اس ارادے سے واپس چلے کہ جو مسلمان حج کرنے کو جاتے ہوں اُن کی رہزنی کریں۔

مکتفی کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے محمد بن اسحق کو ان کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ مگر یہ لشکر بے نیل مرام واپس آیا۔ اور قرامطہ نے حاجیوں کے قافلے پر حملہ کر کے اکثروں کو قتل کر ڈالا اور تاجروں کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ پھر بنی طولون کا مال جسے لوگ مصر سے مکۂ معظمہ لیے جاتے تھے وہ بھی قرامطہ کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ اس کے بعد شہر حمص کے قریب باقی ماندہ حاجیوں کو قرامطہ نے گھیر لیا۔ ادھر سے مکتفی نے دوسری فوج روانہ کی جس پر وصیف بن صوارتگین سردار تھا۔ اور بہت سے نامی گرامی افسر

بھی موجود تھے۔ شہر حمص کے قریب مقابلہ ہوا۔ قرامطہ بڑی بہادری سے لڑے اور کامل دو روز تک معرکہ گیرودار گرم رہا۔ تیسرے روز قرامطہ کو شکست ہو گئی۔ اور ایسی سخت شکست کہ خود ذکرویہ کے سر پر ضرب آئی جس کے صدمے سے وہ غش کھا کے گر پڑا۔ اور فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا خلیفہ احمد بن قاسم مع اپنے بیٹے اور بی بی کے بھی گرفتار ہوا۔ گرفتاری کے پانچویں دن ذکرویہ مر گیا۔ اس کی لاش بغداد میں لا کے مصلوب کی گئی۔ اور سر کاٹ کے خراسان بھیج دیا گیا تاکہ اُن حاجیوں کے متعلقین کو اطمینان ہو جو لوٹے مارے گئے تھے۔ ذکرویہ کے باقی ماندہ ہمراہی بھاگ کے شام پہنچے۔ وہاں حسین بن حمدان موجود تھا۔ اُس نے بھی ان کا قتل و قمع شروع کر دیا۔ الغرض شام و عراق دونوں جگہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے قرامطہ کی بیخ کنی کی جانے لگی۔ اس طریقے سے سنہ ۲۹۴ھ میں قرامطہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔

حیرت کی بات ہے کہ اس واقعہ کو ابن اثیر نے سنہ ۲۹۴ھ میں بیان کیا ہے اور ابن خلدون سنہ ۳۹۴ھ میں لکھتا ہے۔ غالباً ابن خلدون میں کاتبوں اور ناسخوں کی غلطی سے اتنا بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ورنہ ایک صدی کا فرق اور اتنی بڑی عظیم الشان غلطی ابن خلدون کے ایسے محقق سے نہیں ہو سکتی۔

قرامطہ کی اس شکست نے اُن کو اس قدر بے وقعت کر دی اور بغاوت پسند قبائل عرب میں اُن کا اثر اس قدر مٹا دیا کہ ابن ذکرویہ اور اُس کے متعلقین کی گرفتاری کے بعد اُس کے دو متبع اور عزیز بدوی عربوں میں گئے اُن میں سے ایک کا نام حداد اور دوسرے نے منتقم بتایا۔ یہ پچھلا شخص ذکرویہ کا سالہ تھا۔ اُن دونوں نے بدویوں کو اپنی مدد اور ابن ذکرویہ کے بہت کا بدلہ لینے کے لئے بہت اُبھارا مگر حسا کر خلافت کی اس درجہ دھاک بیٹھ گئی تھی کہ کسی نے اُنھیں مدد نہ دی اور اس طرح قرامطہ کا زور ٹوٹ گیا۔

تصانیف مولانا محمد عبد الحلیم صاحب شرر مرحوم

تاریخی ناول

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	الفانسو	۱۲ر
۲	ایام عرب جلد اول	[illegible]
۳	بابک خرمی ہر دو جلد	[illegible]
۴	جویائے حق حصہ اول	[illegible]
۵	زوال بغداد	[illegible]
۶	طاہرہ	[illegible]
۷	عزیزہ مصر	[illegible]
۸	رومتہ الکبریٰ	[illegible]
۹	مفتوح فاتح	[illegible]
۱۰	فلپانا	[illegible]
۱۱	فلورا فلورنڈا	[illegible]
۱۲	لعبت چین	عہ
۱۳	مینا بازار	عہ
۱۴	نیکی کا پھل	عہ

خیالی ناول

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	آغا صادق کی شادی	۱۰ر
۲	اسرار دربار حرام پور حصہ اول	۵ر
۳	اسرار دربار حرام پور حصہ دوم	۵ر
۴	حسن کا ڈاکو کامل	[illegible]
۵	خوفناک محبت	[illegible]
۶	عجب ماں دولہن	عہ

تواریخ

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	تاریخ خلافت	۴ر
۲	سقلیہ میں اسلام	۱۲ر
۳	عرب قبل اسلام	[illegible]
۴	عصر قدیم	[illegible]

نمبر	نام کتاب	قیمت
۵	مسیح و مسیحیت	[illegible]
۶	تاریخ یہود	[illegible]

سوانح عمریاں

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	ابوبکر شبلی	عہ
۲	افسانۂ قیس	۴ر
۳	حسن بن صباح	۶ر
۴	خواجہ معین الدین چشتی	۶ر
۵	ملکہ زنوبیہ	۴ر
۶	سکینہ بنت حسین	۶ر
۷	قیصر [illegible]	۴ر
۸	امالی المتین	۶ر
۹	قرۃ العین	۴ر
۱۰	ابوالحسنین	[illegible]
۱۱	ذی النورین	۱۰ر
۱۲	سیر علما	[illegible]

متفرق تصانیف

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	اسیری بابل	۴ر
۲	زمانہ اور اسلام	۴ر
۳	خبث عم	۱ر
۴	اسلام کا قانون	۴ر
۵	الحکم الرفاعیہ	۴ر
۶	حقیقۃ النفس حصہ اول	[illegible]
۷	" حصہ دوم	[illegible]
۸	معاشرت	[illegible]
۹	سیر علما	[illegible]
۱۰	ہند کی مذہبی تحریک	۲ر
۱۱	سفر نامہ [illegible]	[illegible]
۱۲	معیار زندگی	۴ر

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱۳	ہندوستان [illegible] تغلق	۴ر
۱۴	معتزلہ	۱۲ر
۱۵	ہندوستان کی موسیقی	۲ر

مضامین شرر

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	شاعرانہ و عاشقانہ	عہ
۲	تاریخی و جغرافی	عہ
۳	مشاہیر رجال	[illegible]
۴	تقسیم مسائل	[illegible]
۵	دینی تحقیق مسائل	[illegible]
۶	اصلاح قوم و ملت	عہ

دلگداز کی مکمل جلدیں

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	جلد دلگداز سنہ ۱۸۹۸ء	[illegible]
۲	جلد سنہ ۱۸۹۹ء	[illegible]
۳	جلد سنہ ۱۹۰۰ء	[illegible]
۴	جلد سنہ ۱۹۰۵ء	[illegible]
۵	جلد سنہ ۱۹۰۶ء	[illegible]
۶	جلد سنہ ۱۹۰۸ء	[illegible]
۷	جلد سنہ ۱۹۱۶ء	[illegible]
۸	جلد سنہ ۱۹۱۷ء	[illegible]
۹	جلد سنہ ۱۹۱۸ء	[illegible]
۱۰	جلد سنہ ۱۹۱۹ء	[illegible]
۱۱	جلد سنہ ۱۹۲۱ء	[illegible]
۱۲	جلد سنہ ۱۹۲۳ء	[illegible]
۱۳	جلد سنہ ۱۹۲۴ء	[illegible]
۱۴	جلد سنہ ۱۹۲۵ء	[illegible]
۱۵	جلد سنہ ۱۹۲۷ء	[illegible]
۱۶	جلد سنہ ۱۹۲۸ء	[illegible]
۱۷	جلد سنہ ۱۹۲۹ء	[illegible]

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱۸	رسالہ دلگداز سنہ ۱۹۳۰ء	[illegible]
۱۹	جلد سنہ ۱۹۳۱ء	[illegible]
۲۰	منتخب مضامین	۱۰ر

تصانیف مولوی محمد صادق حسن صاحب

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	پاداش عمل حصہ دوم	[illegible]
۲	" " سوم	[illegible]
۳	" " چہارم	[illegible]
۴	" " پنجم	[illegible]
۵	دولت ہسپانیہ عرب حصہ سوم	[illegible]
۶	" " چہارم	[illegible]
۷	" " پنجم	[illegible]
۸	مجذوب	۸ر

تصانیف مرزا محمد عسکری صاحب

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	اکا دہی	۴ر
۲	مرزا غالب کی ہنسیاں	[illegible]

تصانیف حکیم سید محمد اسحٰق صاحب

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	مسلمانان ہند جلد اول حصہ اول	۲ر
۲	" " " دوم	۶ر
۳	" " سوم	۸ر
۴	" " چہارم	۹ر
۵	" " پنجم	۷ر
۶	نیرنگ زمانہ	[illegible]
۷	راہ دحت	[illegible]
۸	[illegible]	[illegible]
۹	[illegible]	۸ر

ملنے کا پتہ :- منیجر رسالہ دلگداز اورنگ آباد دکن

دلگداز

(۱) یہ رسالہ مولانا شرر مرحوم کی یادگار میں ماہانہ شایع ہوتا ہے۔

(۲) اس میں ادبی اور تاریخی مضامین ہوتے ہیں۔

(۳) ایڈیٹر کے علاوہ دیگر مضمون نگار اصحاب کے مضامین بھی شایع ہو سکیں گے۔

(۴) ہر رسالے کا حجم کم سے کم ۳۲ صفحے ہوتا ہے۔

(۵) چندہ سالانہ مع محصول ڈاک ایک روپیہ آٹھ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) وی پی کی صورت میں مصارف وی پی کی رجسٹری کو شامل کرکے ایک روپیہ گیارہ آنے کا وی پی ہوگا۔ (علاقہ سرکار عالی میں وی پی ایک روپیہ چودہ آنے سکۂ عثمانیہ کا ہوگا)

(۶) خط و کتابت محمد صدیق حسن ایڈیٹر گداز اورنگ آباد دکن کے پتہ سے کی جائے۔

(۷) اشتہارات کی اجرت فی اشاعت پورے صفحے کے چار روپیہ۔ اگر زیادہ مدت کے لیے اشتہار دیا جائے گا تو اس اجرت میں ۶ ماہ کے لیے ۱۰ فیصدی اور ایک سال کے لیے ۱۵ فیصدی کمی کردی جائیگی۔

(۸) ایک صفحے سے کم اشتہار نہ لیا جائے گا اور اجرت ہر صورت میں پیشگی لیجائیگی